آواز کا رنگ

غیاث صدیقی

بہ تشکر و تعاون

ایچ، ای، ایچ دی نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد دکن

ناشر

مکتبۂ شعر و حکمت: ۷۶۴-۲۰-۲۲ بازار نورالامرا، حیدرآباد ۲۴

آواز کا رنگ

غیاث صدیقی

اشاعتِ اوّل مئی ۱۹۷۳ء دو ہزار

کتابت : محمد داؤد علی

طباعت : اکسل فائن آرٹ جامع مسجد
محبوب چوک، حیدرآباد اے۔پی

ناشر : مکتبۂ شعر و حکمت، حیدرآباد

قیمت : پندرہ روپے 15/=

ملنے کے پتے

۱۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو، عابد روڈ حیدرآباد
۲۔ مکتبۂ شعر و حکمت، بازار نورالامرا، حیدرآباد ۲۴
۳۔ شالیمار پبلی کیشنز، ملک پیٹھ جدید، حیدرآباد ۳۶
۴۔ نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد ۲
۵۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ۔ دہلی، بمبئی، علی گڑھ
۶۔ مجاہد صدیقی ۲۲-۵-۲۴۲ کالی کمان حیدرآباد ۲

○○○

ترتیب

غزل

والدِ مرحوم

حضرت میر معین الدین علی خاں متینؔ (معین رقم)

کے نام

جن کے فیضِ صحبت نے مجھے محبّت اور محنت کا ادراک عطا کیا

لبِ اظہارِ تمنّا کے ہر اک پھول میں ہے
تیری آواز کی خوشبو، مری آواز کا رنگ

غیاث صدیقی

تعارف

غیاث صدیقی کا نام حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ پچھلے بیس پچیس برسوں سے اپنے شہر میں ایک خوش گو اور کلاسیکی آداب کو برتنے والے پختہ مشق شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ حیدرآباد سے باہر ادبی دنیا میں انھیں جاننے پہچاننے والے اتنے نہیں، کیوں کہ وہ اپنی عزلت پسندی کی وجہ سے چھپنے چھپانے اور مختلف عنوانوں سے اپنے نام اور کلام کا اشتہار دینے سے کتراتے رہے ہیں۔ گاہے گاہے اُن کی نظم یا غزل یا کوئی مختصر سا تنقیدی مراسلہ یا مضمون کسی ادبی رسالے میں شائع ہوتا رہا ہے۔ عام شہرت اور مقبولیت کے لئے انھوں نے مستقل اور باضابطہ مہم کبھی نہیں چلائی۔ اُن کی کم گوئی اور نمود ناپسندی کے باعث اُن کو شخصی طور پر جاننے والے بھی اس حقیقت سے کم ہی باخبر رہے ہیں کہ شاعری اُن کا مشغلہ نہیں بلکہ صحیح معنوں میں اوڑھنا بچھونا ہے، وہ شاعری کسی شوقِ گریزاں وگزراں کے تحت نہیں کرتے بلکہ اُسے ایسا فن مانتے ہیں جو مستقل ریاض اور مسلسل انہماک چاہتا ہے۔ انھوں نے لوازمِ شعر اور آدابِ فن پر جتنی محنت کی ہے، اتنی توجہ شاید ان کے ہم عصروں نے کم ہی اس فن کے حقایق پر کی ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ شاعری اور شعری تنقید کا منفرد جریدہ "شعر و حکمت" اُن کا مجموعۂ کلام "آواز کا رنگ" شائع کر رہا ہے۔

کوئی ڈیڑھ دو برس قبل اردو نظم پر میرے ایک مضمون کی اشاعت کے بعد کچھ

ادبی رسائل میں تنقید اور شخصی مخالفت کا جو سیلاب مراسلوں کی صورت میں اٹھا تھا اس کے پسِ پشت شاعروں کی خود اعتمادی کی کمی اور احساسِ محرومی کی کارفرمائی کو زیادہ دخل تھا۔ اسی زمانے میں جدید شعری تنقید پر غیاث صدیقی کا ایک مختصر سا مضمون بھی میری نظر سے گزرا۔ مجھے اس بات پر حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ وہ جدید نظم سے نہ صرف گہری دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ انھوں نے خود بھی اس صنف میں چند تجربے کیے ہیں۔ اُن کے مضمون میں شکایت کا رنگ بھی تھا اور ایک حد تک انھوں نے مجھ سے اختلاف بھی کیا تھا حالانکہ نظم میں ان کے تجربوں سے اپنی ناواقفیت کے لیے میں اتنا موردِ الزام نہیں تھا جتنا خود اُن کی اشاعت گُریزی کو اِس معاملے میں دخل تھا جلد ہی مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ اُن کی تنقید کسی شخصی تحریک یا غرض پر ہرگز مبنی نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بہت سے ناقدینِ شعر کو چھوڑ کر مجھ سے اپنے پہلے مجموعے پر پیش لفظ کی فرمائش نہ کرتے۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ شخصی روابط اُنھیں اب بھی اتنے ہی عزیز تھے جتنے پہلے کبھی رہے ہوں گے، اس کے باوجود ادبی تنقید میں اختلاف اور رائے زنی کو انھوں نے دوستانہ مراسم میں حائل نہ ہونے دیا۔ دوستانہ مراسم آج کے لیے نہ تو اپنی تعریف کرانے کا وسیلہ ہیں، نہ کسی ناقد سے اپنے اختلاف کو چھپانے کا پردہ، موجودہ ادبی فضا میں جب کہ ادبی رسائل کے مدیروں اور ناقدوں کو ہمارے شعرا ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، یہ رویّہ قابلِ قدر بھی ہے، اور شعر سے بے لوث تعلق کا ثبوت بھی۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں ہماری زبان میں کسی رسالے کی ادارت شہرت حاصل کرنے کا سب سے سستا وسیلہ ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس چور دروازے سے کبھی کبھی کم صلاحیت افراد بھی نہ صرف شعر و تنقید کی دنیا میں دَرّانہ داخل ہوجاتے ہیں بلکہ شہرت کے طالب اور اشتہار کے شیدائی لکھنے والوں کی ایک اُمتِ پریشاں انھیں اپنا امام بھی مان لیتی ہے، کسی بھی ادبی جریدے کے

مراسلات کے صفحات پڑھ لیجئے، ایسے لکھنے والوں کی خاصی تعداد آپ کو مل جائے گی جو رسالے کے مدیر کے ناقابلِ اعتنا کلام ہی کو حاصل مطالعہ قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے یہی مراسلہ نویس ادیب دوسرے رسالے میں اُسکے مدیر کی اِنہی الفاظ میں اتنی ہی مبالغہ آمیز تعریف کو روا رکھنے میں بھی کبھی حیا کو پاس نہیں آنے دیتے۔ اس کے جواب میں انھیں امامت و رہبری کے شایق مدیرانِ کرام کی طرف سے تعریف کے کھوکھلے سیپ بخش دیے جاتے ہیں، اس طرح تحسینِ باہمی ایک دوسرے کی شہرت و اہمیت کے اشتہار کا کام کرتی ہے غیاث صدیقی کا رویہ ایسے شہرت طلب اور مدیر پرست لکھنے والوں کے برعکس رہا ہے یہی وجہ ہے کہ نہ تو اُن کے کلام کو وہ پذیرائی حاصل ہوئی جو اُن سے کم درجے کے شعرا کو نصیب ہو جاتی ہے، نہ وہ کسی خود نگر اور تملق پسند اڈیٹر کی نگارہ انتخاب کی عدل ناآموز میزان پر پورے اُتر سکے۔ غیاث صدیقی کے دوستانہ تعلقات حیدرآباد کے ہر ادبی رسالے کے اڈیٹر سے رہے ہیں۔ سلیمان اریب جو "چراغ" "سب رس" اور "صبا" کے مدیر رہے، ان کے بچپن کے دوست ہم مدرسہ اور ہم سبق تھے، یہ غیاث صدیقی کی خود اعتمادی اور خود شناسی ہے کہ انھوں نے اس دیرینہ تعلق کو اپنی شہرت کا وسیلہ نہ بنایا۔ وہ دوستی اور ادب کو ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے۔ آج بھی ان کے حیدرآباد میں ایسے لوگوں سے مراسم ہیں جو کسی رسالے یا اخبار کی ادارت سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، وقار خلیل، محمود خاور اور ایسے کئی حضرات سے ان کے شخصی مراسم ہیں، جن کے جرائد و رسائل اُن کی شہرت کا وسیلہ بن سکتے ہیں لیکن غیاث صدیقی جانتے ہیں کہ شاعری اپنی لسانِ استعداد سے خود اپنا حق مانگ سکتی ہے، اس کے لئے اپنی زبان کو آلودہ کرنا لاحاصل رسوائی کے سوا کچھ اور نہیں۔ یہی اعتماد کسی دھوم دھڑکے کے بغیر ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے پیچھے بھی کار فرما ہے۔ انھوں نے نہ تو پیشگی اشتہارات کے ذریعے اپنے مجموعے کی اہمیت کا اعلان کیا ہے، نہ سربرآوردہ

اور گروہ بند ناقدین سے اُن کے گروہ میں شمولیت کا جعلی صداقت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعر کا کلام خود اس کا سب سے اچھا تعارف ہوتا ہے۔

غیاث صدیقی کے تعارف میں رسمی تعریفی فقروں کی بجائے میں اُن کی شخصیت کے چند پہلوؤں اور کلام کی ایسی خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں جو اُن کے طرزِ فکر و اندازِ شعر گوئی کو سمجھنے میں قاری کے لئے مناسب پس منظر کا کام دے سکیں۔ کسی شاعر کے کلام کو اپنے شعری نقطۂ نظر اور معیاروں کے سانچوں میں ڈھالنا نہ تو شاعر کے ساتھ انصاف ہے اور نہ تنقید کے ساتھ۔ وہ عمومی سماجی، سیاسی، نفسیاتی پس منظر بھی اس سلسلہ میں بے کار ہے جو کم و بیش ہر شاعر کے تعارف میں بطور تمہید ٹانک دیا جاتا ہے۔ ایک ہی ماحول اور یکساں سماجی تقاضوں کے تحت رہنے کے باوجود ہر شاعر کی ذہنی دنیا ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ غالب، مومن اور ذوق تینوں کا زمانہ، تاریخی تقاضے، معاشرت اور زمانی تغیّرات بظاہر یکساں تھے، اس کے باوجود اُن کی شاعری اور اندازِ فکر میں تفاوت ہے، یہ تفاوت ان کی اپنی اپنی افتادِ طبع اور اپنے عہد کو قبول کرنے کی صلاحیت کے فرق کا نتیجہ ہے۔ ایک ہی زمانے اور حالات میں رہنے کے باوجود تینوں کی ذہنی دنیا بھی الگ تھی اور خارجی ماحول بھی۔ خارجی ماحول شاعر کے لئے اسی حد تک معنی رکھتا ہے جس حد تک وہ اُس کی داخلی موضوعی زندگی اور تجربوں کا جزو بن سکے اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے عہد کے تمام شاعروں کا خارجی ماحول یکساں ہوتے ہوئے بھی ایک نہیں، ہر شخص اُس کا اثر اپنی استعداد اور اُفتاد کے مطابق قبول کرتا ہے اور خارجی ماحول اسی حد تک اُس کے تخلیقی عمل سے مناسبت رکھتا ہے۔ لہٰذا عمومی کُلیئے اور شاعری کے موضوعات و مسائل کے متعلق تعمیمی آرا عدم تناسب (IRRELEVANT) ہو جاتی ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہمارے کسی ہم عصر شاعر

کو اقدار کی شکست کا کوئی تجربہ ہی نہ ہو، کیوں کہ اس کا امکان ہے کہ اس کی اپنی ذاتی اور داخلی زندگی اس تجربے سے دوچار ہی نہ ہوئی ہو، اسی طرح صنعتی تہذیب کے مسائل موت کا خوف، زندگی کی بے معنویت، تنہائی وغیرہ وغیرہ ایسے موضوعات جو ہماری جدید شاعری کے، کبھی بجا اور اکثر بے جا طور پر شناخت نامے سمجھے جاتے ہیں ممکن ہے کسی شاعر کے تخلیقی تجربے کا جزو ہی نہ بنیں، اس لیے بلا وجہ ہر ہم عصر شاعر کے ذکر میں ان مسائل کی تفصیل بھی نامناسب ہو سکتی ہے۔ موضوعات و مسایل، کلّیوں اور بنے بنائے سانچوں کو کسی کی شاعری پر منطبق کرنے کی کوشش سے بہتر یہ طریقہ کار ہے کہ ہم اس کی تخلیقات کا براہِ راست بغیر کسی توسط کے مطالعہ کریں، توسط گمراہ کن ہوتا ہے۔ ہر تخلیق پارہ مستقل بالذات وجود ہوتا ہے، جس کے قوانین و قواعد خود اس کی نوعیت سے متعین ہوتے ہیں۔ فن پارہ اپنے اصول آپ متعین کرتا ہے اصول یا کلّیے اس کی ہیئت و مواد کا تعین نہیں کرتے۔ یہ کوشش بھی ایک فعلِ عبث ہے کہ ہم ہر ہم عصر شاعر کو جدید ہی ثابت کریں، اگر ایسا کرنا کسی قانون یا شریعت کی رو سے واجب بھی ہو تب بھی ہمیں جدید کی تعریف ہر شاعر کو دیکھ کر اس کے کلام کے مزاج کے لحاظ سے کرنی ہوگی۔ جدید ہونا بھی بذاتِ خود کوئی خصوصیت نہیں۔ اس کا تعلق بھی فن پارے سے ہی ہے۔ کوئی فن پارہ اپنی ہیئت و مواد کے لحاظ سے لاکھ جدید ہو لیکن اگر وہ فن پارہ نہیں تو محض جدیدیت کے نام پر قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

ان باتوں کی طرف اشارے اس لئے ضروری ہیں کہ غیاث صدیقی کی شخصیت جس طرح دوسرے شاعروں سے مختلف ہے، اسی طرح ان کی شاعری بھی ایک جداگانہ مزاج و آہنگ کی حامل ہے جس پر تنقید کی کوئی ترشی ترشائی قبا موزوں نہیں ہو سکتی انھوں نے بغیر اس کی فکر کئے ہوئے شعر کہے ہیں کہ ان کے شعروں کو جدید مانا جائے گا یا قدیم کہا جائے گا۔ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی منسلک رہے ہیں مگر اس زمانے میں

بھی انھوں نے کبھی اپنے شعر پہ ترقی پسندی کا ملمع نہیں چڑھایا۔ اُن کے لئے
شاعری بذاتِ خود ایک خوشگوار شغل ہے اور اُن کے اپنے محسوسات شعر کے
شکل گر ہیں۔ یہ ذاتی محسوسات کسی نظریے کی توثیق بھی کر سکتے ہیں اور تردید بھی۔
کسی ہم عصر موضوع سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں، اور غیر متعلق بھی۔ دوسرے شاعروں
سے مماثل بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف بھی تخلیقی ادب میں اس اختلاف و اتفاق،
توثیق و تردید، تعلق و عدم تعلق کی ہر زمانے میں گنجائش رہی ہے اور آج بھی ہے
غیاث صدیقی کے یہاں یہ چیز زیادہ نمایاں اس لئے ہے کہ وہ فیشن اور شہرت،
تحریکوں اور رجحانات سے بے نیاز رہ کر شاعری کرتے رہے ہیں اس کا یہ مطلب
ہرگز نہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کی تبدیلیوں اور ادبی تقاضوں کا اثر قبول ہی
نہیں کیا۔ ہر حساس اور ذی شعور ان اثرات کو قبول کرنے پر مجبور ہے لیکن یہ لازمی
نہیں کہ اس کا ردِ عمل بھی ویسا ہی ہو جیسا دوسروں کا ہوتا ہے۔

غیاث صدیقی سے میری پہلی ملاقات آج سے بیس برس قبل انجمن ترقی پسند
مصنّفین حیدرآباد کے جلسوں میں ہوئی، وہ خوش شکل، خوش وضع، اور خوش کلام
آدمی ہیں، ان سے رسمی ملاقات کا پہلا تاثر یہی ہوتا ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ معالج
ہیں، خاندانی حیثیت سے وہ جاگیر دار ہیں، اور جاگیرداری کے بھی اس مخصوص طبقے سے
متعلق جس کا خاندانی رشتہ نظام حیدرآباد سے ملتا ہے، ان کا ماضی جاہ و منصب،
شوکت و حشمت، امارت و ثروت، وجاہت و حکومت سے ہم کنار رہا۔ جاگیرداری
کے خاتمے کے بعد ان کا حال عظیم الشان ڈیوڑھیوں اور حویلیوں کی شکست و ریخت
کی بے رونقی اور نوحہ خوانی کے آسیب سے دوچار ہوا۔ ایسی ہی ایک بلند و بالا
حویلی کے ایک گوشے میں ان کا مطب ہے اور بالائی حصے میں قیام۔ وضعداری، مروّت
نرم گفتاری اور اگلے وقتوں کی شرافتیں انہیں ورثے میں ملیں۔ معاش کی جہد

اور تجارتی و کاروباری دنیا سے ان کا سابقہ جاگیر داری کے خاتمے کے بعد ہوا۔ شعر و نغمہ، نفاست و خوش ذوقی ان کے موروثی ماحول میں رچی بسی تھی، مشاعرے، جلسے، رقص و نغمہ کی محفلیں، علمی ادبی تذکرے، پرانے مخطوطے، اور قلمی تصویریں، تاریخی آثار اور ہتھیار، یہ سب اُس ماحول کے اجزا تھے، ان بکھرے ہوئے اجزا کو وہ آج بھی سوجتن سے سمیٹ کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اُن کا ماضی ہے جو زمانے کی مخالف ہواؤں کی زد پر ہے۔ اس ماضی سے لگاؤ کے باوجود وہ ماضی پرست نہیں انھیں حُسن سے بھی لگاؤ ہے، اور زندگی بھی عزیز ہے۔ زندگی سے یہ تعلق ہی ان کو زمانۂ حال کا فرد بناتا ہے۔ انھوں نے مذہب کے تصوّرات اپنے ماضی سے ورثے میں پائے ہیں، اور انھیں اپنے حال سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے، وہ تنگ نظر تقشف پسند، مذہبیّت سے دور ہیں، مگر مذہبیت کی روح، ان کے طرزِ معاشرت اور شاعری میں رچی ہوئی ہے، ماضی کی بربادی نے انھیں مایوس و دل گرفتہ نہیں کیا وہ دل کھول کر ہنسنا اور زندگی کے ہر مسئلے کا مسکراتے ہوئے سامنا کرنا جانتے ہیں، وہ یار باش آدمی ہیں، مگر خود نمائی اور شہرت طلبی سے دُور۔ ادب کے معاملات میں وہ محفل آرائی کے باوجود کم گو اور عزلت پسند ہیں۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں وہ شرکت کرتے ہیں، مگر ان کی سیاست سے خود کو آلودہ نہیں کرتے ماضی و حال، محفل آرائی و عزلت پسندی، مذہبیت اور وسیع المشربی کی یہ خصوصیات بظاہر تضادات معلوم ہوں گی مگر ایک فرد کی زندگی ان کو اپنے شخصی تجربے میں پگھلا اور تپا کر ایک نامیاتی کُل بنا دیتی ہے۔ شاعری اس نامیاتی کُل کا اظہار ہوتی ہے، جس میں شخصیت کا کبھی ایک رخ سامنے آتا ہے کبھی دوسرا۔

ابتدا میں غیاث صدیقی کو میں نے غزل کے ایسے شاعر کی حیثیت سے جانا جو زبان، عروض، قواعد کا خیال کلاسیکی آداب کے ساتھ رکھتا تھا۔

ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شعر پر ان کی تنقید اسی نقطۂ نظر سے ہوتی تھی۔ وہ نظمیں اُس زمانے میں بھی کہتے تھے مگر میرے ذہن میں ان کا کوئی ارتسام محفوظ نہیں رہ سکا۔ کئی برس تک ان سے ملاقات نہ ہو سکی میں علی گڑھ چلا آیا، وہ گلبرگہ چلے گئے دو برس قبل ان کی چند نظمیں نظر سے گزریں، اسی سال جون میں ان سے ملاقات ہوئی تفصیل سے گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ پچھلے برسوں میں انھوں نے غزل کی جگہ نظم پر زیادہ توجہ کی ہے۔ اور ایسی نظموں کا مجموعہ شائع کرنے والے ہیں جو اپنی ہئیت اور موضوع، طرزِ فکر اور انداز نظر کے لحاظ سے تجرباتی اہمیت رکھتی ہیں، غزل کی کلاسیکی اور روایتی انداز کی شاعری سے نظم کی نئی جہتوں تک یہ سفر ان کے ذہنی اور شعری رویوں کی تبدیلی کا بھی مظہر ہے اور ہمارے ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بھی عکاس۔ غیاث صدیقی نے اپنے مجموعے میں صرف نظمیں ہی شامل کی تھیں۔ مگر میرے کہنے پر انھوں نے کچھ ایسی غزلیں بھی اس مجموعے میں شامل کر لی ہیں جو بڑی حد تک غیر روایتی ہیں، اور غزل کے محاورے میں تبدیلی کا مظہر۔

"آواز کا رنگ" میں ایک حمد بھی ہے مگر وہ روایتی انداز سے مختلف ہے، ایک طرف تو اس نظم میں شاعر نے توحید و تصوّف کے ایسے نازک مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ دوسری طرف خدا اور بندے کے رشتے پر ایک سوالیہ نشان بھی لگا دیا ہے، اس نظم کا عنوان ہے "لکم دینکم ولی دین" یہ حمد غیاث صدیقی کے طرزِ فکر کی مخصوص جہت کا اشاریہ ہے جس کی مزید توسیع اُن کی دو نعتیہ نظموں "معجزے" اور "سلام اُس پر" (بائے بسم اللہ ..... کو ہاتوں کے کھیتوں میں اُگا) میں ہوتی ہے، مذہبی عقیدے کو اپنے تجربے کی اساس بنا کر روایتی مضامین کو نئے معانی سے ہم آہنگ کرنے کی یہ کوششیں توجہ طلب ہیں۔

غیاث صدیقی کی کئی نظموں میں قول محال (PARADOX) سے کام لیتے

کا رجحان نمایاں ہے "کشمکش" اس قسم کی نمائندہ نظم ہے۔ غیاث صدیقی کی نظموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مجرد تصورات کو زندگی کے روزمرہ تجربات، موسموں، رنگوں مناظر اور عام اشیا میں ڈھال کر ٹھوس تمثالات بنانے کی کوشش کی ہے "ندامت"، "اکائی" "دولت شب" اس طرز ادا کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں، انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر بھی لکھا ہے جن کا براہ راست تعلق ہمارے سماج سے ہے۔ "چپراسی" "ٹیچر" اور "تیس سال کا قرض" ایسی ہی نظمیں ہیں لیکن ان کے طرز بیان نے پیش پا افتادہ باتوں کو بھی اچھوتا بنا دیا ہے، اس مجموعے کی چند نظموں میں شوخی کی ایک زیریں لہر بھی کار فرما نظر آتی ہے "حنا کا رنگ بگڑتا رہا ....." اس کی ایک مثال ہے۔ جہاں یہ زیریں لہر ابھر کر سطح پر آگئی ہے وہاں کہیں گہرے اور کہیں ہلکے طنز کے دائرے بنتے چلے گئے ہیں۔ اس طرح غیاث صدیقی نے استعاراتی انداز، تمثالات، براہ راست بیان، شوخی اور طنز ہی کے مختلف ہتھیاروں سے اپنے اظہار کا کام لیا ہے۔ ان کی کچھ نظمیں جیسے "اجنتا"، "خلوت" اور "چشم براہ" روایتی طرز میں لکھی ہوئی ہیں لیکن ان میں بھی ایجاز، جو انھوں نے غزل کے آرٹ سے سیکھا ہے، اور اشاراتی انداز ملتا ہے جس نے رومانی لہجے کی ان نظموں کو بھی تازگی بخش دی ہے۔ ان نظموں میں نہ تو پچھلے دور کی وضاحت ہے، اور نہ جدید دور کی شعوری ابہام پسندی و علامتیت، غیاث صدیقی نے ان دونوں سے ہٹ کر اپنا انداز بنانے کی کوشش کی ہے، مجھے امید ہے کہ ان نظموں کو اسی نظر سے دیکھا جائے گا، ان پر جدید تر نظموں کی یکسانیت کی چھاپ بھی نہیں، ان میں سوچنے کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اور ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے شعوری طور پر دوسروں سے مختلف ہونے اور ایک انوکھا طرز بیان اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری نظر میں ایسی کوشش شعوری ہو یا غیر شعوری مستحسن ہے۔

غیاث صدیقی کے سوچنے کا انداز، جذبے اور احساس کی زبان سے آشنا ہے ان کی

انفرادیت کو شی بیان کے تجربے کو بھی تجربے کا بیان بنا دیتی ہے۔
غیاث صدیقی نے غزل کی روایت اور کلاسیکی لہجے سے جس طرح فیض اٹھایا۔
اور غزل کو نئے محاورے سے ہم آہنگ کیا ہے، اس کے ثبوت میں چند اشعار پیش کرنے
پر اکتفا کروں گا ؎

کوئی نہ دیکھ سکا آرزو تو سب کو تھی
میں چیختا رہا، میلے میں کھو گیا چہرہ

تتلیاں کس پہ نچھاور ہیں غیاث
پھول بن میں وہ اکیلی ہو گی

بہاروں میں کہاں سے لائیں دامن
یہاں سب کے لباس اُترے ہوئے ہیں

نکہت گل میں نمی ہے کہ پسینہ گُل کا
پاؤں بوجھل ہیں صبا کے، یہ تھکن بھی دیکھو

اک زیرِ لب معاہدۂ جاں سے ان کو عار
اے آرزوئے دل، ترے مرنے کے دن تھے

دنا کی تیغ لئے، شاعری کا جال لئے
ازل سے کوئی مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

پیالہ زہر کا پی کر زبانِ حق کھولو
جو مصلحت سے ہے خاموش وہ بھی جھوٹا ہے

تشنہ لب لائے ہیں تجھ تک ترے عارض کے سراب
پہلے تو پیاس بجھا آگ لگانے والے

غیاث صدیقی کی قادر الکلامی، مشکل قافیوں اور ردیفوں میں اپنا رنگ

دکھاتی ہے۔ اس طرح کی بیشتر غزلیں انھوں نے اپنے پہلے مجموعے میں شامل نہیں کی ہیں، ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

گویا ہو رازِ دل، وہ لبِ گفتگو تراش
مانی کا ہاتھ چوم کے پھر آرزو تراش

ایسی غزلوں کی کلاسکیت چاہے جدید نہ مانی جائے لیکن ان میں صنّاعی کا وہ پہلو ملتا ہے جسے کبھی بھی شاعری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ غیاثؔ صدیقی کی کلاسکیت بھی سنبھلی ہوئی ہے، اس لیے کہ انھوں نے شاہ نصیرؔ اور انشاءؔ مصحفیؔ کی طرح کڈھب زمینوں میں غزل طرازی کو جدیدیت سمجھ کر اختیار نہیں کیا، حالانکہ اس غلط فہمی میں ہمارے بعض خاصے باشعور متشاعر اور شاعر مبتلا ہو چکے ہیں۔

"آواز کا رنگ" ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے مطالعے کے لیے نہ تو ادب و تنقید کے بلند آہنگ اصول تراشنے کی ضرورت ہے اور نہ ہمالیائی امیدیں باندھ کر اس پر چڑھائی کا ارادہ کرنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسے شاعر کے بیس پچیس سالہ فنی و شعری ریاض کا مرقّع ہے جس نے خود کوئی اصول اور کلیے نہیں تراشے بلکہ شعر کو اپنے محسوسات کے اظہار کے لئے برتا اور آدابِ فن کو ہر حال میں ملحوظ رکھا ہے، اس اظہار میں نہ مقبولِ عام عصری روش کو اپنانے کا جذبہ ہے نہ ناقدین کے بتائے ہوئے فارمولوں میں خود کو ڈھالنے کی کوشش، نہ بلند آہنگ دعوے ہیں، نہ دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والے تجربے، نہ ایسی روایت پرستی کہ تبدیلی کا گذر ہی نہ ہو، اور نہ ایسی جدّت جو روایت سے یکسر منحرف و منقطع ہو جائے، یہ ہمارے دور کے ایک حسّاس، ذی شعور، تعلیم یافتہ، سچے اور اچھے انسان کے تجربات کا آئینہ خانہ ہے جسے اس کے شعور نے روشنی دی ہے اور اس کے تخلیقی عمل نے شکلوں سے مزیّن کیا ہے۔ اس آئینہ خانے کو تخلیق کی آنکھ ہی سے دیکھنا چاہیئے ممکن ہے آپ کو کہیں اپنے

کسی تجربے کی کوئی شکل بھی نظر آجائے اور ایسا ہونا ناگزیر ہے، یہی اس بات کا ثبوت ہوگا کہ غیاث صدیقی کی شاعری ہم عصر حسیت ہی کا ایک حصہ ہے اور ان کے شعری عمل نے اس بے حدت ورنگ حسیت کو آواز کا رنگ عطا کیا ہے۔

میں یہ چاہوں گا کہ قاری اس پیش لفظ کو بھی اپنے اور شاعر کے درمیان حائل ہونے نہ دے، کیوں کہ کبھی کبھی تعارف نگار کے اپنے تعصبات یا اس کے خلاف قاری کے تعصبات بھی شعر کی روح تک پہونچنے میں حائل ہوتے ہیں۔

وحید اختر

شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۲ء

اپنے بارے میں

دہانِ خامہ سے
ٹپکے ہیں خون کے قطرے
شفق کے پھول بھی
یاقوت بھی
شرارے بھی
نگاہ
خانوں میں تقسیم ہو سکی نہ کبھی
جبینِ فن پہ کوئی مُہر ثبت کر نہ سکا
حیات
انجمن و خلوت و شکیبائی
جمالِ ذات کی وادی میں
جشنِ مرگ بپا

قضا کے قعرِ عدم
خود کُشی کی جلتی گپھا
اُمید و بیم کے سورج

نَفَس سزا ہے
مگر
لمحۂ تبسّم بھی
زرِ قناعت ہے

خاکم بدہن

خدا کو ایک کہنا شرک ہے میں مانتا ہوں
تعدّد شرک ہے میں جانتا ہوں
تسلسل شرک ہے پہچانتا ہوں
خدا بے جسم ہے، بے سمت ہے، بے رنگ بھی ہے
زماں کی اور مکاں کی قید سے آزاد بھی ہے
فنا کی، روپ کی آلائشوں سے پاک بھی ہے
مگر مجھ میں
تعدّد بھی، تسلسل بھی
بدن بھی، سمت بھی اور رنگ بھی
تخلیق کر ڈالے
زمیں پر، آسماں پر، وقت پر
دشتِ فنا پر، روپ پر
کیا دسترس مجھ کو
عطا؟
سب کچھ عطا ہے
کیا کہوں
کچھ کہہ نہیں سکتا
میں کس کا عکس ہوں

(۱۹۷۱ء)

سلام اُس پر

بائے بسم اللہ
کوہانوں کے کھیتوں میں اُگا
تھا سراپا
رحم و ایثار و عطا
حسن کو اور عشق کو
فولاد کا پیکر دیا
دل امانت
آنکھ پردہ
ہونٹ دستورِ وفا
ہاتھ قربت کی علامت
امن تسلیم و رضا
پاؤں منزل
بات غنچوں کے چٹکنے کی صدا
احمدِ بے میم کا ابلاغ

ناظر ذات و خلوت کا
بشر کا روپ
وجہ اللہ
خالق اپنی ہی تخلیق پر شیدا
سلام اس پر



(۶۱۹۷۲)

معجزے

غار میں
سانپ کا زہر بھی
آبِ کوثر بنا
یہ لُعابِ دَہَن
فتحِ خیبر بنا
علم کے نور سے
آنکھ روشن ہوی
آبِ دُرِّ یتیم آئینہ بن گئی
عصمتِ گل کی تعظیم کرتے ہیں اب
دل کو ہونٹوں کو تسلیم کرتے ہیں اب



(۱۹۷۱ء)

کشمکش

فاصلے آنکھ سے قلب تک
فاصلے آنکھ سے ذہن تک
مستقل ہیں تو کیا
مختصر تو نہیں
راستے پرسکوں، پُرخطر
مرکبِ راہ
کشتی، کجاوے
صبا، صرصر و ابر ہیں
راہ
واضح بھی، مبہم بھی
افعی بھی، اژدرِ دم بھی
یا
چاندنی میں
کبوتر کے بہتے ہوئے کاسنی سرد سائے
سمندر میں مہتاب کا عکس بھی

یا خدا
آنکھ کا، ذہن کا، قلب کا
یہ مثلّث
مری جاں نہ لے لے



۱۹۷۱ء

سکون

بدن کی ساری شریانیں
تڑپنا بھول بیٹھی ہیں
یہ کب سے سرد پیشانی
لکیریں پی رہی ہے
کہ آنکھوں کا دوآبہ منجمد ہے
برف کی یہ حکمرانی
چشم و ابرو سے گزر کر
زرد تلوؤں کا احاطہ کر رہی ہے

دل کے زخمی ہاتھ بھی شل ہو گئے ہیں
آرزو کی کشتیاں
دریائے خوں میں رک گئی ہیں
سانس کی گلیوں میں
بوسیدہ سی دیوار یں
برابر گر رہی ہیں

روشنی، حرکت، حرارت
بند کیسوں میں
خلاء کی سمت
سورج کی امانت بن کے
گویا اُڑ رہی ہیں

رات کا عفریت
ہر شئے کو نگلتا جا رہا ہے

واہ رے آغوشِ سکوں
ایسا سکوں
جو ٹوٹ نہیں سکتا کبھی



(۱۹۷۳ء)

تیس ۳۰ سال کا قرض

وہ دوشیزہ ہے اب تک
تیس صدیاں اُس کے اعضا کو کچل کر
ریگ زاروں میں
کہیں گم ہو گئی ہوں گی
سرابِ آرزو کی جھیل بن کر
سو گئی ہوں گی
کبھی زلفوں کی کرنوں پر سیاہی
کبھی چہرے کی تحریروں پہ غازہ
کبھی آنکھوں کی دھندلاہٹ میں سُرمہ
کبھی بے رنگ و بوسیدہ لبادے پر
سنہرے کام کا لچکا
گلے کی سِلوٹوں پر ترُ ملی کا جھوٹا چنتاک
مگر دل میں ہے اک ایسا خزانہ
جہاں سے قرض مل جاتا ہے سب کو
ہزاروں دل کے دعویدار

حاتم

مگر یہ قرض تو کوئی چکائے
جو پتھر کی سِلوں کے نیچے
آ کر دیا گیا ہے



اکائی

میرا سایہ
میرے قدموں کے نیچے
جب آجائے

میرا لہجہ
میرے دل کی موجوں میں
جب گھل جائے

میرے نام سے
جب تم کو سب پہچانیں
تم آجانا



(۱۹۷۰ء)

برسات

اس دھرتی کو پیاس لگی ہے
پانی لاؤ
مَے چھلکاؤ
یا پھر خون کی بارش کر دو
سہمے سہمے نیل گگن میں
چھوٹے چھوٹے روزن کر کے
آدم کی آنکھیں لٹکا دو
بارہ مہینے مینھ برسے گا



(۱۹۶۹ء)

چپراسی

ورثے میں بوسیدہ جوتے
جھکتا سر
محکوم بدن
اُمّیدوں کی جھولی میں
ننھّے کو لوری دے کر
بدصورت ممتاز محل کے گندے آنچل کو پھیلا کر
موٹے موٹے آنسو پونچھے
تاج محل بنوائے

○

دولتِ شب

رات کی تہذیب
زلفوں کا تموّل
دولتِ یاقوت و مرجاں پر ہیں مُہریں
اور آنکھوں کے جواہر خانے بے در
جسم کی بے داغ چاندی سے ٹپکتا عطرِ خس
گوشۂ دل میں عقیقِ سُرخ پیوستہ
جبیں کی لوحِ سادہ

بے نیازِ جام و بادہ
تشنگیِ قرب کی دولت زیادہ
رات یہ کیسی غنیمت رات ہے
کیا خبر
کب صبح ہو
کب خون میں ڈوبی کرن
آنکھوں سے ہو کر دل میں اُترے

○

زرد تمنّا

نظر کے ہاتھ ستاروں کو چھونے اٹھّے ہیں
رگوں میں دوڑنے پھرنے لگیں تمنّائیں
دماغ امید کے پھولوں سے ہو گئے روشن
قدم کو سمت ملی، خواہشوں کو جادہ ملا
مگر
جوان و حسین جسم منجمد کیوں ہیں
لیے ہزاروں کفن
برف کا یہ کوہِ گراں
ذرا سے چاکِ تغافل سے کیسے نکلا ہے
یہ کیسی زرد تمنّا ہے گوشۂ دل میں
حیات کاسۂ خلوت میں بھیک بن جائے
ضمیر سو جائے

○

ندامت

آنکھوں میں ہیں ٹوٹے آئینے کی کرچیں
کتنی لکیریں پی کے جھکی ہے
پیشانی کی تختی
ہونٹوں کے کونے پھیلے ہیں
رُت جمی ہے
مٹھی میں ہیں مایوسی کے پیلے پیلے سکّے
پاؤں کے کھمبے بے چھت
لیکن بوجھل بوجھل
دل کا کبوتر
نیل گگن میں ڈوبا ڈوبا تازہ



(۱۹۶۹ء)

شعر

لفظوں سے معنوں تک
میرا فاصلہ ہے
ہونٹوں سے کانوں تک
میرا سلسلہ ہے
مجھ تک آکر
مجھ کو چھو کر
مجھ کو تم محسوس کرو

○

رشتے ناتے

پنسل نے میلے کاغذ پر
پھولوں کی تصویریں کھینچیں
کشتی نے پانی پر
اپنی رفتاروں کے نقش بنائے
نالی میں خوشبو پھیلی ہے
نغمے میں گالی گونجی ہے
یہ ہیں رشتے ناتے

○

ہم سفر

تجھ کو خدا سے مانگ کے میں نے
جیسے سب کچھ مانگ لیا ہے
شہد کے پیالے
طور کے شعلے
گہری جھیلیں
ٹھنڈے سائے
اور دھنک کو شبنم میں پھولوں میں بسا کر
جکڑ لیا ہے
تجھ کو خدا سے مانگ کے میں نے
جیسے سب کچھ مانگ لیا ہے

○

دستک

یہ نرم آنچ
تبسم کی سرحدوں میں اسیر
یہ مہکی سانس
جھجکتے ہوئے قلم کی لکیر
یہ کس کی یاد کی چاپ
آرہی ہے دل کے قریب

صدائے دل ہے
کہ بجتی ہوئی سی اِک زنجیر

○

اپنا چاند

یہ خلاؤں کی مکیں
سنگ ریزوں کی امیں
داغ دھبّوں کی زمیں
چاند نہیں، چاند نہیں
چاند کہتے ہیں محبت کے حسیں لمحے کو
چاند نغمے کا بدن
چاند تبسّم کی ضیا
چاند پھولوں کی مہک
چاند اعزاز ہے تنہائی کا
چاند انعام ہے یکجائی کا
چاند دستک ہے درِ دل کے قریب
یا کلیدِ درِ مے خانہ ہے
ہم اسی چاند کو پیغامِ محبّت سمجھے
قربِ محبوب کی پُرنور علامت سمجھے

(۱۹۶۹ء)

شعلے کا بدن

لبِ نازک پہ مچلتا ہوا
نغمے کا بدن
جھلملاتی ہوئی باہنوں میں
وہ ہیرے کا بدن
چشم و ابرو پہ رُکا
پاؤں کی مہندی پہ جھکا
مرمریں
ریشمیں
موجوں میں
وہ شعلے کا بدن

○

کبڑا

وہ سارے ظلم، وہ ساری اذیتوں کو اٹھائے
نگوں، خمیدہ، فسردہ
جھکی جھکی نظریں
زمیں پہ نقشِ وفا کو تلاش کرتا ہے
وہ پیچھے چھوڑ کے آیا ہے شہرِ ماتم کو
زمین سخت تھی اور انگلیاں بھی زخمی تھیں
اب آگے کھیت ہیں
اور اس کے پاؤں کے نیچے
نرم نرم مٹّی ہے
لبوں پہ طنز و تبسّم کے نقش جب اُبھرے
تو اُس نے مٹھّی بہت احتیاط سے کھولی
اور اک حسین سی انگشتری کو مٹّی میں
دبا کے دُور ہٹا
وہ سوچتا رہا کچھ دیر
کس کا تحفہ تھا
کس بے وفا کا پیماں تھا
زمیں بھی اُس کی نگاہوں میں بے وفا ٹھہری
کہ آسماں کی کمر جھک گئی ہے
کیا وہ بھی
زمیں پہ نقشِ وفا کو تلاش کرتا ہے

○

اُمیدوں کی تھکن

رات بھر
تین سو پینسٹھ شمعیں
اجنبی نور کا الزام اٹھائے سر پر
حُرمتِ صبحِ مساوات کی قسمیں کھا کر
اِک تبسّم کے لیے
اشک بہاتی ہی رہیں
نور تسلیم ہوا
شعلہ بھی تقسیم ہوا
نور کی دھجّیاں جب بال سے باریک بنیں
دستِ امید نے سوزن میں پرویا ان کو
چاک دو چار، رفو ہو نہ سکے
نور سب ختم ہوا
اور اک چاک کے زخموں میں دریچہ سا کھلا
زرد یرقان زدہ رینگتا سورج نکلا
رات کی کوکھ سے لُوٹا ہوا سرمایہ ہے
پھر نیا سال اُمیدوں کی تھکن لایا ہے

○

احساس

برف کا تودہ
سورج سے ڈر جاتا ہے
سوکھا پتّہ
صبا سے کیوں گھبراتا ہے
پانچ کا نوٹ
بینک سے کیوں شرماتا ہے
ننّھا دیپک
ہوا چلے تو
زمیں پہ سجدے کرتا ہے
لیکن میں تو شاعر ہوں
برف کا تودہ، سوکھا پتّہ
پانچ کا نوٹ اور ننّھا دیپک
یہ تو میرے روپ نہیں ہیں
البتّہ
جب تیری نظر سے گرتا ہوں

تو گمنامی کا ایک فرشتہ
میرے بدن کے ٹکڑے چن کر
گہرے کنویں میں رکھ دیتا ہے



سفر

سفر کہاں سے کہاں تک
کسی سے مت پوچھو
کلی کا نور
جہنّم کی آگ
رنگِ شفق
حسین چہرے
بدنما شکلیں
کسی کو مت دیکھو
کسی نگاہ میں بجلی
کسی نگاہ میں ویرانیاں
نظر نہ اٹھاؤ
کسی کے ساتھ ہے زادِ سفر
کسی کا جسم مسافر
کسی کا چہرہ حوادث کی داستانِ الم

کسی کی جیب میں پوشیدہ رحمتِ یزداں
کسی کے ظاہر و باطن کی فکر
تم نہ کرو
لباس اضافی ہیں
سفر کہاں سے کہاں تک
کسی سے مت پوچھو

عرفانِ ذات

میں اپنے تن سے
اپنے من سے واقف ہوں
یہ کیمرے میری آنکھوں کے
کب کُھلتے ہیں
کیوں کُھلتے ہیں
اور کس کے عکس ان میں منقّش ہو جاتے ہیں
کس کس کے دُھل جاتے ہیں

یہ ہاتھ بڑے ظالم ہیں
جب پھول سے مس ہو جاتے ہیں
یک سر مخمل بن جاتے ہیں
جب جوئے شیر بہاتے ہیں
پتھر کو موم بناتے ہیں
میں اپنے تن سے

اپنے من سے واقف ہوں

یہ دل میرا
اندھا ہے لیکن دیکھتا ہے
بہرہ ہے لیکن سنتا ہے

○

ہائے وے

میرے بدن پر سونا پگھلے
چاندی بھی بل کھائے

دھوپ بہے
بارش سر پہ ٹپکے
ہوا طمانچے کھائے
سرگوشی
اقرارِ محبت
کانوں میں گونجے
جھوٹے وعدے
سازش
دھوکہ
من کا بوجھ بڑھائے
سب کچھ سن کے
سب کچھ دیکھ کے
ہونٹوں کو سی لینا ہے
دل کو کشادہ کر کے
سب کو راہ دکھا دیتا ہے

○

مراجعت

خون میں لتھڑی ہوئی ایک کرن
کس دریچے سے اُتر آئی مرے کمرے میں
ایک بے سمت سفر
ایک بے وجہ تھکن
ایک بے نام خلش
صبح کے پاؤں پہ زخموں کے نشاں
رات کی رات میں بدلا ہے جہاں
لب کھُلے تھے
مگر آئی ہے صدا قدموں کی
اور قدموں کے نشاں کہتے ہیں
میرے دروازے پہ آکر کوئی
لوٹ گیا ہو جیسے

○

مرے دشمن، مرے دوست

"دشمن دشمن" چیخنے والو
آسمان جب روتا ہے
روئی کے گالے
شجر حجر کے زخموں پر اُگ آتے ہیں
دھرتی
دھانی رنگ کی کُرتی چولی پہنے
سبز دوپٹّہ تانے
جیسے بچھ جاتی ہے
میخانے کے دروازے بھی کُھل جاتے ہیں
روٹھے دلوں میں
من جانے کی آشا
جیسے ناچ اٹھتی ہے
تم بھی آؤ
آسمان کے ساتھ تھوڑا تم بھی رو لو
دل کے دھبّے سب دھو ڈالو

(۱۹۷۲ء)

○

خلوت

شفق کا رنگ، گلوں کی شمیم، قُرب کی آنچ
سُرورِ خلوتِ قلب و نظر کی عمرِ دراز
نہ احتیاطِ تکلّم، نہ امتحانِ نیاز
جنونِ مدحِ سراپا مری حسین نماز

ستارے مانگ سے بہہ کر جبیں پہ لرزاں ہیں
گلاب نم ہیں تو سُنبل بھی کچھ پریشاں ہے
لبوں پہ عکسِ دلِ بے حجاب رقصاں ہے

سکوں کے پاؤں میں پازیب اُس تھکن کے ہیں
جو انتظار کی صدیوں سے مضمحل ہو کر
دلوں کی راہ میں آہٹ کا کام دیتی ہے
دھنک کے روپ میں انگڑائیاں بھی لیتی ہے

نہ رنگ و بُو میں کوئی فاصلہ نہ قربت ہے
گلوں میں دونوں عناصر کی ایک قیمت ہے
تصنّعات کے ہر پیرہن کو چاک کرو
تھکن کے پھول مری قربتوں پہ برسا دو

(۱۹۶۷ء)

چشم براہ

روشیں چاندنی راتوں میں سُہاگن بن کر
اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے پھولوں کے چراغ
اپنی سانسوں میں بسائے ہوئے کلیوں کی شمیم
اپنی آنکھوں میں سنبھالے ہوئے مستی کے ایاغ
زرد رُو برگِ چکیدہ میں چھپا کر چہرے
لب پہ بے ساختہ مانوس کراہوں کو لیے
تیری آہٹ، تری سنچل کا پتہ لیتی ہیں

رینگتی بیلیں، تجسُّس کی جبینیں لے کر
تیرے ہر نقشِ قدم پر ہیں نگوں سجدہ کُناں
تیرے قدموں سے لپٹنے کو ہیں ہر دم بے چین
دیکھ اِدھر گوش بر آواز ہیں ننھی بیلیں
شاخ در شاخ جھروکوں سے تجھے جھانکتی ہیں
تُو نظر آئے تو وہ شاخِ شجر پر جھولیں
تُو قریب آئے تو رخسار کو جھک کر چھو لیں



(۱۹۶۷ء)

نیند

زلفیں بکھرائے ہوئے کون چلی آتی ہے
یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا یہ سیاہی کے محل
کتنے جگنو ہیں جو اس جسم میں در آئے ہیں
جسم پر رینگتی ہیں نور کی کرنیں جیسے
دل کے زخموں پہ کوئی دستِ محبت رکھ دے
یا کوئی نور کے سیّال کو قطرہ قطرہ
دل کے ہر زخم پہ شبنم کی طرح ٹپکائے

یک بیک مجھ سے قریب آنے کی خواہش کرکے
دولتِ نکہت و مہتاب کی بارش کرکے
ہر بُنِ مو کو لطافت کے خزانے دے کر
تلخیِ زیست کو کچھ خواب سہانے دے کر
اُٹھ کے پہلو سے مرے کون چلا جاتا ہے



(۱۹۶۷ء)

دل کبھی آئینہ خانہ تھا

دل کبھی آئینہ خانہ تھا تمنّاؤں کا
اب ہے شبنم کی طرح پلکوں پہ ریزہ ریزہ
اپنی پلکوں پہ مرے اشک سجا کر رکھ لے
یہ ہیں تہذیب و محبّت کا حسیں آمیزہ
ایک آواز کی گونج ' ایک ہی تصویر کا عکس
میرا دل بھی ہے ترے دل کی طرح پاکیزہ
اتنی قُربت ہے کہ دُوری کا گماں ہوتا ہے
میرا دل تیرے گلُوبند کا ہے آویزہ

بھیگی آنکھیں ہیں تری ایسی خمار آلودہ
پھول نرگس کے ہوں جس طرح بہار آلودہ
جب بھی جاگی ہے تری زلف سجانے کی لگن
قلب کے ہاتھ اسی دن سے ہیں خار آلودہ

شاخِ گُل ٹوٹ گئی خون کی دھاریں پھوٹیں
قلبِ غنچوں کے رُکے کلیوں کی نبضیں چھوٹیں

لاشۂ شب کی گری زلف تو اندھے ہوئے سب
گُل کی شمعیں بجھیں، خوشبو کی کمانیں ٹوٹیں
برق نے آگ کی کلیوں سے سجائے گلشن
کس کمیں گاہ سے صرصر نے بہاریں لوٹیں
رنگِ گُل اور رگِ گُل ہے شرار آلودہ



(۱۹۶۷ء)

اردو کی پہلی غزل ــــ بھاگ متی

خلوتِ شاہ میں آہٹ ہوی گھنگرو بولے
بڑھ کے تھامے ہے کوئی دستِ حنا آلودہ
ہاتھ تہذیب کے نغمتوں کے لبوں تک پہنچے
رُک گئیں گیت کی نبضیں تو لب آہستہ کھلے
جیسے پیمانِ وفا قول و قسم راز و نیاز
جیسے فانوس کی آنکھوں میں بھر آئیں آنسو
جیسے تھم تھم کے مہک اٹھے بدن کی خوشبو
دلِ عاشق نے کہا "لے یہ دکن تیرا ہے"
بھیگی پلکوں نے کہا "آج قلی میرا ہے"

خلوتِ شاہ میں آہٹ ہوی گھنگرو بولے
لبِ یاقوت سے لہرائی وفا کی خوشبو
کوئی فرزندِ دکن ہو یہ اُسے یاد رہے
یہ وطن میرا مرے نام سے آباد رہے
مُہرِ تصدیق ہوی ثبت تو لب کانپ گئے

رتجگا

سیاہ رات کے کانٹوں میں جب بھی اُلجھے ہیں
یہ پاؤں زخمی ہوئے ہیں کھلائے ہیں گل زار
چراغ بن گئے پھولوں سے روشنی لے کر

سیاہ رات کے کانٹوں میں جب بھی الجھے ہیں
یہ ہاتھ روکشِ دستِ حنائی بن بن کر
شفق کی آگ سے کلیاں اٹھا کے لائے ہیں
لبِ حبیب سے سُرخی اڑا کے لائے ہیں

سیاہ رات کے کانٹوں میں جب بھی اُلجھے ہیں
کسی شباب کے کاکل جمال کے گیسو
سنور گئے ہیں گھٹاؤں کی طرح راہوں پر
تو آنگ آنگ سے جھانکے ہے برق کی مُسکان

سیاہ رات کے طوفاں میں شمع دل کو غیاث
بچا سکیں گے نہ فانوس میری سانسوں میں
کہ رتجگے کی مُبارک سحر کی عمر دراز
○

شبِ مہتاب

رات کی مرطوب سانسیں چل رہی ہیں ہر طرف
منعمِ مہتاب چاندی کے ورق برسائے ہے
اک شفق اِٹھلا رہی ہے اک شفق بل کھائے ہے
ایک سورج اوڑھے بادل کی ردائے زرنگار
اک ستارے کے برابر چل رہا ہے تیز تیز
نرم آوازوں میں سرگوشی ہے کیسی غم گریز
اک تنا ور پیڑ کے سایے میں کچھ معصوم دل
گیت کی نبضوں کو روکے لحن کے دامن چھپائے
ہلکے ہلکے قہقہوں کو دے رہے ہیں زندگی
پھلجھڑی چھوٹی کہیں، مہتاب جاگ اُٹھے کہیں

ساعدوں کی نقرئی دولت پہ ٹھنڈی انگلیاں
آج پھر محسوس کرتی ہیں دلوں کا ارتعاش
اک ملائم سرسراہٹ ریشمی ملبوس کی
سبز کہساروں میں جیسے چاندنی کا آبشار

خیر مقدم کے لیئے محرابِ رنگ و نور ہیں

اجنتا

سیاہ سائے دمِ صبح کوہ پر آئے
فضا پکار اُٹھی صاحبِ ہنر آئے
یہ حُسن و عشق کے رنگیں پیامبر آئے
وطن کو چھوڑ کے معصوم تیشہ ور آئے

دل و نظر نے بہم ہو کے ایک سازش کی
وفورِ شوق نے عرضِ ہنر کی خواہش کی

نگاہِ کوہ فلک پر اٹھی زمیں پہ گری
ادائے زلف بنی روئے نازنیں پہ گری
مثالِ برق، دلِ عشقِ آتشیں پہ گری
اُٹھی تو پائے جمادات آذریں پہ گری

عجیب بات ہے کس کی سمجھ میں آتی ہے
کہیں حیات بھی پتھر میں مسکراتی ہے

یہ تیشہ ور ہیں نظر کو زبان دیتے ہیں
لبوں کو نطق و تبسّم کی شان دیتے ہیں
تبسّموں کو محبّت کی آن دیتے ہیں
محبّتوں کو صداقت کی جان دیتے ہیں

یہ سنگ دل کو محبّت سے موم کرتے ہیں
دہانِ تیشہ سے پتھر میں روح بھرتے ہیں

یہ جانتے ہیں کہ پتھر پہ جب بہار آئے
آیزد کے ہاتھ میں تصویرِ حسنِ یار آئے
بنا کے آئینہ خود حیرتوں کو پیار آئے
کہ حسن و عشق کے احساس کو قرار آئے

یہ جانتے ہیں کہ پتھر میں دل بھی ہوتا ہے
سویدا پھیل کے ہونٹوں پہ تِل بھی ہوتا ہے

بنائے پاؤں تو منزل کی تشنگی سی ہوئی
سنواری زلف تو پھولوں میں بے کلی سی ہوئی
تراشے ہونٹ تو تن من میں گدگدی سی ہوئی
اُبھاری آنکھ تو غاروں میں روشنی سی ہوئی

کٹے ہیں قوسِ تبسّم کی شکل میں یاقوت
شفق کی شاخ سے ٹوٹے ہیں ہونٹ کے شہتوت

بدن کے زاویے بدلے چمک گئے مہتاب
فلک کہاں کہ زمیں پر بھی ٹوٹتے ہیں شہاب
خطوطِ جسم نے ڈھالے ہیں مرمریں محراب
گلابیوں سے برابر چھلک رہا ہے شباب

بنے ہیں تاج محل بازوؤں کی چاندی میں
بہے ہیں گنگ و جمن دورِ تشنہ کامی میں

سپردگی بھی کچھ ایسی کہ جس میں عظمت ہے
شراب و جام میں جس طرح پاک قربت ہے
خمارِ چشم میں سوئے کدوں کی حرمت ہے
گداز باہیں حمائل ہیں کیسی جنّت ہے

یہ حسن و عشق کا کتنا حسین سنگم ہے
دکن کے قلب میں اُردو غزل مجسم ہے

شکستہ پا ہوے آہو تراشنے والے
تڑپ تڑپ گئے پہلو تراشنے والے
کمان بن گئے ابرو تراشنے والے
خموش سو گئے گھنگرو تراشنے والے

زمیں پہ پاؤں تھے سر آسماں سے اوپر تھے
یہ کم سخن اِسی ارضِ دکن کے آذر تھے

خرد کی لوح پہ مجنوں کا نام چھوڑ گئے
بھری بہاریں لبریز جام چھوڑ گئے
بپائے ناز شکستہ خرام چھوڑ گئے
بدستِ حسن ادھورا سلام چھوڑ گئے

خلائے دَور کے فن کار اگر یہاں آئیں
تو اپنے ماضی کی دولت پہ ناز فرمائیں



(۱۹۶۶ء)

سرگوشیاں

شریان نے ورید سے کہا :۔

نیلم کو شرمانے والی
مجھ کو روند کے جانے والی

نگر نگر سے آنے والی
دل کو آگ لگانے والی

کعبۂ دل کے پھیرے کر کے
سانس کے ایوانوں سے گزر کے

دل کی امانت مجھ کو دے دے
سُرخ قیامت مجھ کو دے دے

ورید نے شریان سے کہا :۔

مرجاں کو شرمانے والی
جسم میں غوطے کھانے والی

تہ خانوں سے آنے والی
موڑ پہ جست لگانے والی

کلیوں کی رکھوالن تو ہے
باغ کی اصلی مالن تو ہے



(۱۹۶۸ء)

برسات کی ایک صبح

نگاہِ مہر اٹھی نور کا ہوا تڑکا
چمک چمک گئی بجلی تو ابر بھی کڑکا
صبا کی چیخ پہ ہر مرغ خوش ادا پھڑکا
کلی کی آنکھ کھلی اور گل کا دل دھڑکا

طلوعِ صبح کے اقرار کے سوا کیا ہے
سحر کی گود میں انوار کے سوا کیا ہے

چمن کے دوش پہ کاکل بنا ہے ابرِ بہار
نگاہ ڈھونڈتی ہے سانچے موتیوں کی قطار
دھلانے آئی تھی شبنم گلاب کے رخسار
ابھی تو لوٹی ہے خورشید کی کرن پہ سوار

شفق شراب بنی غنچے بن گئے ہیں جام
پیو کہ اہلِ محبت پہ مے نہیں ہے حرام

شجر نہا کے اٹھے ہوئے گل نکھر آئی
گلوں کو چوم کے جب عندلیب شرمائی

تو شاخِ گل نے بڑے ناز سے لی انگڑائی
بجائیں تالیاں پتّوں نے برق لہرائی

کلی کلی کا گریبان تار تار ہے آج
روش روش پہ یہاں شعلۂ بہار ہے آج

یہ سیلِ آب ہے یا زندگی کا درپن ہے
بدستِ شاخِ شجر آرسی ہے کنگن ہے
نہ صرف مانگ بھرا موتیوں سے دامن ہے
صبا سے سرو کا جھکنا سلامِ گلشن ہے

وطن کے نور کو فطرت سلام کرتی ہے
سلام لو کہ محبت سلام کرتی ہے



(۱۹۶۵ء)

مخدوم

ایک ہیرے کے ہزاروں پہلو
منعکس نور کہیں
رنگ کہیں
سخت جاں ایسا کہ لاکھوں نظریں
اُس سے ٹکرا کے پلٹ جاتی تھیں
نور کی دھار سے کٹ جاتی تھیں
کہتے ہیں آج اُسی ہیرے کو
اپنے سینے سے لگائے ہوئے مٹّی کی تہیں
ڈوبتی جاتی ہیں تاریکی میں
ڈوبتی جاتی ہیں تاریکی میں



(۱۹۶۹ء)

ٹیچر

(ڈاکٹر ذاکر حسین کی نذر)

تنگ و تاریک گلی
شہرِ چراغاں میں پلی
اپنی بے نامی پہ نازاں تھی بہت
اپنی تضحیک پہ شاداں تھی بہت
اُس کو معلوم تھا
قسمت کے سیہ خانے میں
نور و ادراک کے کچھ ایسے جھماکے ہوں گے
جن کی آغوش میں یہ لوح و قلم کے ایواں
جگمگائیں گے، سنور جائیں گے
دیکھیے، آ گئے کچھ لوگ
یہ کس ملک کے شہزادے ہیں
اِن کی پیشانی پہ مہتاب کی تحریریں ہیں
ان کے سینوں میں چراغ
انگلیاں نور کی ہیں
دوش پر لے کے حصیر آئے ہیں
چاند سے جیسے سفیر آئے ہیں

○

بنت الورد

(اندرا گاندھی کے نام)

آنکھ میں آنسو، لب پر چُپ ہیں
دل پر لاکھوں داغ بھی دیکھو
کیسوں میں سوراخ بھی دیکھو
سانس سزا ہے
چارہ گروں کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں
قوم کی عزّت
فٹ پاتھوں پر سوتی ہے
ایوانوں میں
کھادی کی دوکانیں ہیں
ننھے دیپک مکتب کی راہوں میں
بجھے پڑے ہیں
کاموں کے انبار لگے ہیں
لیکن سب بے کار کھڑے ہیں

عیدیں بارودوں کی خوشبو
تہواروں میں خون کا رنگ
تیرے قلم کی اک جنبش سے
ایسے جہنم کے شعلوں میں
پھول بھی کھل سکتے ہیں

○

ساتھی

ہم ایک تھے، ایک ہی رہیں گے
ہماری نسلیں، ہماری تہذیبیں ایک ہیں
جس کو شک ہو
لباس و افلاس
گریہ و تبسّم کا روپ دیکھے
وہ خون کا امتحان کرلے
گر دپ دیکھے
گھروں کے فاقے، ملوں کے خاکے
غبار
کھیتوں سے لے کر
اپنے دلوں کے کعبوں میں
مندروں میں
بھرا ہوا ہے

بہار کی رُت
جوانیوں کی طلسم سازی
ہر ایک تصویر میں ہے یکسانیت کا جادو
جو سب کے سر چڑھ کے بولتا ہے
دیارِ مغرب کے خونی ہاتھوں نے
کتنے ملکوں کی سرحدوں کے بنا کے نقشے
بچھا کے بارود آگ دی ہے
ہمارے ملکوں کی سرحدوں پر
یہ فوج کے کارواں کیوں ہیں
یہاں تو پھولوں کی بیل
رنگ و نکہت کو
اپنے آنچل میں لے کے آئے
عروسِ نو کی طرح لجائے
ذرا یہ دیکھو
کہ جب کراچی میں کوئی مرتا ہے
لوگ دلّی میں اُس کو روتے ہیں
یہ تعلق
گواہ اس بات کا ہے ساتھی
ہم ایک تھے
ایک ہی رہیں گے

دیوی

باورچی خانے سے اٹھ کر
میز پر آئی
بچوں کو سمجھا سمجھا کر
اپنا خون پلایا
جوتوں کو پالش کی
توشے باندھے
بستے بھی تقسیم کیے
بچے مدرسے کو جب بھاگے
میری جانب آئی
بستر کو کچھ صاف کیا
پھر ٹانک گولی لائی
میوہ، دودھ، بریڈ، ترکاری
سامنے رکھ کر بیٹھی
میٹھے تبسم کے چمچوں سے

میرے دِقیلے جسم کو
اپنا خون پلا یا
ڈھیلا پلاؤز اور مسکی ساری پہنی
اُلٹے سیدھے بال سنوارے
اور خدا حافظ کہہ کر
وہ دفتر کو بھاگی
لیکن یہ کیا ؟
ٹفن یہیں پر چھوڑ گئی ہے
اے معبود !
میرے پاؤں ہیں مجھ سے باغی
میرا دفتر مجھ کو میرے گھر میں '
کب کا تھوک چکا ہے
سارے رستے بھول چکا ہوں
کیسے ٹفن پہنچاؤں ؟

○

حنا کا رنگ بگڑتا رہا

مری شریکِ حیات اس لئے تھی غصّے میں
حنا دوا کے بہانے مَطب میں آتی تھی
سیاہ بالوں کا جُوڑا
دہکتے گالوں میں ڈمپل
بہکتی چال اُس کی
شکایت اُس کو فقط دردِ دل کی ہوتی تھی
مطب میں دل کو پرکھنے کا ایک آلہ تھا
وہ جب بھی آتی تھی
آلہ مجھے نہ ملتا تھا
وہ میری بیوی کی اک آہنی تجوری میں
مری تلاش، مری بے بسی پہ ہنستا تھا
اِسی طرح سے کئی سال آئے اور گئے
سیاہ بالوں میں کرنوں کی روشنی پھوٹی

یہ کون منتظر ہے

کرم نا آشنا ہوں
پھر بھی آدھی رات کو گھر آ چکا ہوں
بجھی سگریٹ سُلگا کر
کنارے نرم بستر کے
میں چُپ چُپ سا پڑا ہوں
کہ پہلو میں دراندڑا ہے
کہیں بیدار ہو جائے نہ بیوی
مگر یہ کیا ؟
یہ خوشبو میرے نتھنوں سے لپٹتی جا رہی ہے
جو ہر خوشبو سے پیاری ہے
ارے اِس لائٹ کو کیا ہو گیا ہے ؟
اندھیرے میں کوئی جگنو ہو جیسے
مرے تکیے پہ کس نے موتیا کے پھول رکھے ہیں ؟
یہ کس کی ٹوٹی ٹوٹی سانسیں

کمرے میں بکھرتی جا رہی ہیں؟
مرے بِڈ کے قریب
افلاس کی دیواریں
اِک منتظر کھونٹی پہ شب خوابی کے پیراہن
جتن سے کس نے لٹکا ہے؟
مرے حمام کی بتّی جلا رکھی ہے
آدھی رات کو کس نے؟
ارے تم ہو!
اِدھر آؤ اِدھر
ہاں ہاں سنبھل کر پاؤں رکھو
کہیں جھولے سے تم ٹکرا نہ جاؤ



(۱۹۷۲ء)

تنخواہ کا پوسٹ مارٹم

صبح کو اک طوفان اُٹھا تھا
دھوبن، درزن اور گوالن کے جھگڑے تھے
گھر کا کرایہ، بچوں کے ٹیوشن کا قصّہ
لائٹ کی بل اور نل کا ٹکس
سامنے کتنے دیو کھڑے تھے
غلّے والے سیٹھ کا بچہ چیخ رہا تھا
اور پڑوسن کی لڑکی کے ہاتھ میں
میرے قرض کی چیٹھی کانپ رہی تھی
گھر کی گلی کے موڑ پہ ساہوکار کھڑا تھا
بیوی نے جیب سے پرس نکالی
جس میں میرے خون پسینے کے موتی تھے
بجمہ کے ہاتھوں نے سارے نوٹ نکالے
مجھ پہ تبسم پھینک کے وہ دالان میں آئی
خوں پسینے کے قطروں کو

اجلے کٹوروں میں جب ڈالا
ساری جونکیں ٹوٹ پڑیں
سورج کب نکلا تھا مجھ کو یاد نہیں
رات، مگر یوں یاد رہی
کہ نجمہ نے فارن کی ساری
اپنے نیم بدن پر ڈالی
میک اَپ کر کے
فرزانہ کے ساتھ
کسی پکچر کو گئی تھی
فرزانہ نے جاتے جاتے
مجھ کو ہنس کر کیوں دیکھا تھا
میں کیا جانوں!



(۱۹۷۲ء)

"باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے"

○

شبِ مہتاب تھی، خاموشی تھی، تنہائی تھی
شاخِ گل میں وہی لرزش وہی انگڑائی تھی
چشمِ نرگس نے قیامت کا نظارہ دیکھا
شاخِ گل سایۂ افعی کی طرح لہرا کر
چاندنی رات کے رخسار پہ اِس طرح جھکی
جیسے یہ بوسۂ مرگ ایک تیافہ تو نہیں
چاند کے داغوں میں اک اور اضافہ تو نہیں

○

(۱۹۷۲ء)

"دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا"

○

دربان کی دشنام طرازی شبِ وعدہ
یہ خطِّ سیہ وصل و طرب، عیشِ دو عالم
یہ سبزۂ خط، رنگِ زمرد، لبِ یاقوت
آنکھوں میں دمِ نزع خرابات کے نقشے
اَے خالقِ شرّ! وسعتِ تخلیق مبارک
عصیان کے عفریت نے اِک گھونٹ پیا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک

○

(۱۹۷۲ء)

"ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا"

○

نغمہ و گل و انجم، ساقیِ نظر پیما
آفتاب ساغر ہیں، مطربِ قمر پیما
حسنِ چار دہ سالہ، عشق رو کشِ صد خضر
مُہر بر لبِ واعظ، فصلِ گل اَبد آثار
ہر نفس ہیں کیفِ مے، ہر قدم پہ نہرِ مے
آم، انگبیں، سب کچھ زیرِ دستِ عیشِ جاں
یہ مری تمنّا کا ایک نقشِ پا گر ہے
دوسرا قدم یا رب ماورائے جاں ہوگا

○

(۱۹۷۲ء)

"اُے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نادو نوش ہے" .... الخ

غالبؔ کا شاہین

میں غالبِ آشفتہ ہوں اے گوشِ حقیقت
سُن لے مرے انکار کہ میں کُشتۂ دل ہوں
ایران کے قالین، یہ افرنگ کے صوفے
ہیں تیری تن آسانی کے مذموم سہارے
ساقی بھی، یہ مطرب بھی، یہ پھولوں کے نظارے
ہیں رات کی بجھتی ہوی شمعوں کے کنارے
جو میں نے کہا، عرش کے طائر نے سنا ہے
یہ غیب کی آواز ہے، یہ قوم کی فریاد

شاعر تو ہوں، سو پشت سے ایسا ہوں سپاہی
عزت کا ذریعہ نہیں روباہ نگاہی
جو فرد کی عزت ہے وہی قوم کی عزت

○ (۱۹۷۱ء)

غالبؔ کا شکوہ و جوابِ شکوہ

خود کو بندہ تجھے خدا جانا
گُم رہی میں تجھے ہُدیٰ مانا
ایک پل کے لئے بھی
اے معبود!
تو نے کی میری ذات کی تصدیق؟
اور نمرود کی خدائی کو
لمحہ بھر کو سہی، صداقت دی
تیرے منکر پہ سایۂ رحمت!
تیرے مومن پہ برق کی زحمت!
ہاں مگر سچ ہے
بھول ہے میری
جب کہ تجھ بِن نہیں کوئی موجود
تیرے احکام کی پذیرائی
میری جاں پر قبول تھی یارب
حق تو یہ ہے
کہ حق ادا نہ ہوا

(۱۹۷۱ء)

○

What is an epigram ? A dwar fish whole,
Its body brevity, and wit its soul.

(COLERIDGE)

ایپگرام[1]

اک پھرتیلا بونا آیا
ہاتھ میں لے کر
ننھا ننھا
تیز، نکیلا نشتر
دھار میں ہے ادراک
وار میں ایک شعور
پھوٹ بہے ناسور

○

(۱۹۷۰ء)

[1] بمعنی مختصر نظم

It lies not in our power to love or hate,
For will in us is over-ruled by fate.

(MARLOWE)

ڈراما

قسمت کے گلشن میں یوں تو
بے شک میرے ارمانوں کے پھول کھلے
لیکن کتنے پھول کھلے
جب دل نے سچ کہنا چاہا
کلیوں کا منھ بند ہوا
جب جھوٹے جھگڑوں سے
اپنی جان بچانا چاہی
تو پھول کھلے، نغمے جاگے
میرے بدن کا اِک اِک ٹکڑا
پودوں کی نمناک جڑوں میں
پھولوں کی بے باک رگوں میں
کلیوں کی مسکانوں میں
تحلیل ہوا

پھر روح کا پنچھی
گلشن کی دیواروں پر کچھ دیر اڑا
پھر سورج کی جانب دوڑا
یہ آخری تھی پرواز اس کی



The greatest of faults, I should say, is to be conscious of none.

(CARLYLE)

اعتراف

معترف ہوں
تری دنیا میں جیا ہوں لیکن
تیری دنیا کو نہ جانا میں نے
یہ تبسم کے سراب
اور الم کی آغوش
اور شہرت کے دفینے
کہیں گمنامی کا سورج
کہیں جلتا ہوا اور آگ اُگلتا ہوا چاند
کہیں برسات کے صحرا
کہیں میخانے کا سناٹا بچھا ہے
کہیں خلوت کا ہجوم
معترف ہوں
تری دنیا میں جیا ہوں لیکن
تیری دنیا کو نہ جانا میں نے

(۱۹۷۱ء)

What stronger breastplate than a heart untainted.
(SHAKESPEARE)

آئینۂ دل

دل پر نشتر برسے
دل پر تیر چلے
زخم کہاں کا
اِک بھی نشانِ زخم نہیں ہے
تیر چلانے والے بھی
نشتر برسانے والے بھی
سب شرمندہ ہیں
اپنے ہاتھ سے اپنے گریباں چاک کرو
میرے دل کے آئینے میں
اپنی اپنی صورت دیکھو
حیرت کے پایاب کنویں میں
ڈوب مرو



(۱۹۷۱ء)

As idle as a painted ship
Upon a pointed ocean.

(S. T. COLERIDGE)

ازل تا ابد

کہتے ہیں
تھا ایک مصوّر
اُس نے بنائی نوکِ قلم سے
ایک سمندر کی تصویر
اور سمندر کی موجوں میں
ایک سفینہ
جب سے اب تک
وہی سمندر، وہی سفینہ
لکڑی کی دیواروں میں محصور رہے ہیں
میرے کمرے میں لٹکے ہیں
جب بھی سفینے کو دیکھا ہے
انساں کے بے نام ارادے
انساں کے مجبور قدم
یاد آئے ہیں

(۱۹۷۰ء)

All are architects of Fate,
Working in these walls of Time;
Some with massive deeds and great,
Some with ornaments of rhyme.

(LONGFELLOW)

انتخاب

تاج محل کے خواب دیکھنا
تصویروں میں جان ڈالنا
اور اجنتا کے غاروں میں
پتھّر دل کو موم بنانا
ہونٹ اگانا
قصّے لکھنا، نظمیں کہنا
نغمے گانا

اپنے من بھاتے سودے ہیں
اپنے اپنے کشکولوں میں
شہرِ ازل سے لائے ہیں



(۱۹۷۱ء)

To meet, to know, to love–and then to part,
Is the sad tale of many a human heart.

(COLERIDGE)

وداع و وصل جُداگانہ لذّتے دارد

کب تجھ سے ملا
کب تیرے دل کو پہچانا
کب تیری میری ناؤ بہی
کب دل سے دل کی بات ہوئی
کیا بات ہوئی
کب آگ لگی
کب آگ بُجھی
تو بھی ناواقف
میں بھی ناواقف
لیکن سارے جگ میں اپنی بات بہی
سورج نکلے، سورج ڈوبے
آنسو کا اِک اِک قطرہ
ہر دل سے نکلا
ہر دل تک پہنچا

O

(۱۹۷۰ء)

The heart of the fool in his mouth, but the mouth of
The wise man is in his heart.

(FRANKLIN)

دو راستے

دل سے لبوں تک
سَو رستے ہیں
گہرے سمندر، چھوٹی جھیلیں
لمبے دریا، سوکھے نالے
دوڑو، تیرو
ڈوبو، ابھرو
غوطے کھاؤ، ناؤ چلاؤ
آبدوزیں بیٹھو
لیکن
وھیل سے بچ کے نکلنا
کھیل نہیں ہے

○

(۱۹۷۱ء)

With all thy faults, I love thee still.

(COWPER)

اکائی

سب کہتے ہیں
عیب ہیں تجھ میں
میں کہتا ہوں
میری آنکھوں سے تو دیکھو

شاخِ گُل پر
پھول بھی میرا، خار بھی میرے

○

(۱۹۷۰ء)

The sun's rim dips; The stars rush out:
At one stride comes the dark.

(COLERIDGE)

اندھیرا

اندھیرا تو نفرت کے قابل نہیں ہے
یہ زلفوں کی ٹھنڈک

یہ پلکوں کے سایے

یہ کاجل کی تحریر

ہر لمس کی ساعتِ بے بہا
یا تھکن زندگانی کے خورشید کی

خود شناسی، مگر بے رُخی

جیسے تاروں کے جُھرمٹ میں

خورشید کی پشت پر

زندگی کا سفر

اک قدم اور آگے بڑھا



(۱۹۷۰ء)

Water, water, every where,
And all the boards did shrink;
Water, water,, every where,
Nor any drop co drink.

(COLERIDGE)

العطش

پیاسی آنکھیں پیاسے ہونٹ
پیاسا سارا بدن
حُسن کے دریا کوچہ کوچہ
حُسن کی جھیلیں روش روش
نومیدی کے ساغر پینا
ناکامی کے شعلے پینا
غم کے خُم کے خُم پی جانا
سب کچھ ممکن
لیکن
تیری آنکھ سے گرنے والے آنسو کو
پی جانا
ناممکن ہے
ناممکن ہے

○

(۱۹۷۰ء)

The moving Moon went up the sky,
And no where did abide;
Softly she was going up,
And a star or two beside.

(COLERIDGE)

خرامِ بدر

رینگنے والا ٹھنڈا شعلہ
جگنو جیسی شمعیں لے کر
آگے پیچھے کالی کالی رات
دُور اُفق پر محوِ خراماں
ہلکی ہلکی، سفید، بلگجی اوڑھنیوں میں
چُھپتے، نکلتے پیر سے سر پہ بہتا آیا
نیند اڑاتا
سوئے ہوئے آنگن کو جگاتا
بند دریچوں کو کھلواتا
بند لبوں کو کانوں تک پہنچاتا
جسموں کو خوشبو میں بساتا
نور لپٹتا، نور بہاتا، نور لٹاتا آیا



(۱۹۷۰ء)

غزل

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے، لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے
(فیض احمد فیض)

مجھ کو آ آ کے جگا جاتی ہے خوشبو چپ چاپ
جب بدلتا ہے کوئی رات کو پہلو چپ چاپ

کیا سکوں بخش اندھیرا ہے یہ مے خانے میں
یا گھٹا چھائی ہے یا کھل گئے گیسو چپ چاپ

صرف قدموں کے نشانوں پہ ہے پھولوں کا ہجوم
لے اُڑی بادِ صبا زلف کی خوشبو چپ چاپ

اس طرف دیکھے ذرا ڈوبتے سورج سے کہو
زلفیں بکھرائے ہے چہرے پہ شفق رو چپ چاپ

حُسنِ اظہارِ ندامت ہے کہ اندازِ ستم
آ کے بیٹھا ہے مرے سامنے کیوں تو چپ چاپ

وہ تو ملتے رہے ہر موڑ پہ ہنس ہنس کے غیاث
دل مرا پیتا رہا درد کے آنسو چپ چاپ

عجیب دوست تھے وہ، دل کو صاف کیا کرتے
نگاہ تک نہ ملائی، معاف کیا کرتے

ہم اہلِ درد ہیں فطرت ہے سر جھکانے کی
وہ اہلِ خشت تھے، دل کا طواف کیا کرتے

اُٹھے سلام کو، لیکن نہ بن سکے دامن
ہمارے ہاتھ، خود اپنے خلاف کیا کرتے

لگائی آگ تو سمجھو کہ دل میں آگ ہی تھی
خود اپنے جرم کا وہ اعتراف کیا کرتے

معاملے تھے دلوں کے، نہ تھی وہ دستاویز
معاہدے سے وہ پھر انحراف کیا کرتے

(۱۹۷۳ء)

ہزار رنگ بدلتا ہے پھول کا چہرہ
چمن میں جھومتا، کھیتوں میں ناچتا چہرہ

گیا تھا ساحلِ دریا پہ کل تو دیکھا تھا
شفق لبوں پہ لگائے تھا شام کا چہرہ

کوئی نہ دیکھ سکا آرزو تو سب کو تھی
میں چیختا رہا میلے میں کھو گیا چہرہ

وہ چھوڑ جاتے ہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ گھر میں
وہ جا چکے مگر آنکھوں میں رہ گیا چہرہ

غیاثؔ آئینہ خانے میں محوِ حیرت تھا
نقاب اٹھائی تو لاکھوں میں ایک تھا چہرہ

(١٩٧١ء)

ہر بُنِ مُو پہ رُسے کے چاند وہ پیکر تم ہو
ساغرِ کیف ہو، پھولوں کا سمندر تم ہو

ناخنو، عقدہ کشائی کرو زخمِ دل کی
کیسے الماس کے ٹکڑوں کا مقدّر تم ہو

سطحِ ساکن نے بنایا تھا مجھے آئینہ
جھیل میں دُور سے پھینکا ہوا کنکر تم ہو

دُھوپ چبھتی ہے مجھے چھاؤں میں جی لینے دو
جس کے سایے میں پڑا ہوں وہ صنوبر تم ہو

خوگرِ ظلم ہوں، احسانِ جفا دل سے قبول
خوف ہے جس کے کرم سے وہ ستم گر تم ہو

آبرو، ماہیٔ بے آب ہلا لو !، لو لو
کس کے پندارِ نگہبانی کے خنجر تم ہو

(۱۹۷۳ء)

گویا ہو رازِ دل وہ لبِ گفتگو تراش
مانی کا ہاتھ چوم لے پھر آرزو تراش

الزام ہو کہ آئینہ تو باوضو تراش
اے آنکھ، جو تراشنا ہو دو بدو تراش

دیر و حرم سے چھوٹا ہوں اے آذرِ خیال
جلتی گپھا میں اس کا بدن چار سو تراش

ساقی! یہ رات میرے سبو میں انڈیل دے
شیشہ اٹھا کے زلفِ مئے مشکبو تراش

اے خامۂ چشمِ نم کے دو آبے میں ڈوب کر
پلکوں کی چلمنوں کو ذرا ہو بہو تراش

قربت کی آنچ، زلف کی خوشبو، حیا کے ہونٹ
اس کائنات کے لئے دل کا سبو تراش

ہر صبح اس کے در پہ صدا دے مثالِ مہر
ہر دم بہانۂ کرم حیلہ جو تراش

اس کی نظر میں سنگ و وفا موم ہیں غیاث
وہ بے نیازِ تیشہ، لبِ آرزو تراش

(۱۹۷۳ء)

چاہت کے دن تجھے یہ مرے مرنے کے دن نہ تھے
شانوں پہ تیرے گیسو بکھرنے کے دن نہ تھے

اک زیرِ لب معاہدۂ جاں سے اُن کو عار
اے آرزوئے دل! اترے مرنے کے دن نہ تھے

آنکھوں میں شوقِ دید ہے دل میں ہجومِ گُل
یہ دشتِ امتحاں سے گذرنے کے دن نہ تھے

یہ فصلِ گل ہے فرشِ گلستاں پہ کیوں نثار
پھولوں کی سیڑھیوں سے اُترنے کے دن نہ تھے

اے خود نمائی، انجمن آرائی کیوں نہیں
خلوت میں گیسوؤں کے سنورنے کے دن نہ تھے

نغمے بہے، نہ جام ہی چھلکے، نہ مہکے گُل
جب بال و پر ہمارے کترنے کے دن نہ تھے

نشتر ہے یادِ بوئے لباسِ صنم غیاثؔ
پھولوں کی آرزو میں گذرنے کے دن نہ تھے

(۱۹۷۱ء)

پپوٹے سُرخ ہیں سُوجے ہوئے ہیں
یہ کِس کی یاد میں کھوئے ہوئے ہیں

ابھی برسات ہو کر تھم گئی ہے
دلوں کے بوجھ کچھ ہلکے ہوئے ہیں

رُکے آنسو کہ طوفاں تھم گیا ہے
سمندر ناؤ میں ٹھہرے ہوئے ہیں

مَیں اُن کے خواب میں زخمی ہوا ہوں
وہ میرے خواب میں سہمے ہوئے ہیں

دھماکہ بن گئیں مایوسیاں جب
بدن کے سینکڑوں ٹکڑے ہوئے ہیں

بہاروں میں کہاں سے لائیں دامن
یہاں سب کے لباس اُترے ہوئے ہیں

(۱۹۷۱ء)

باتیں سب اپنے مطلب کی
صورت دیکھو بھولی بھولی

ہجر کی ناگن ہاتھ آئی ہے
شانوں پر جب زلف ٹٹولی

آنکھ بھر آئی، شیشہ ٹوٹا
آخرِ شب تصویر بھی بولی

بند کیا ہے اس نے دریچہ
سورج نے جب کھڑکی کھولی

ڈھونڈ رہی ہے بادِ صبا کو
روش روش کلیوں کی ٹولی

(۱۹۶۷ء)

ہیں شبک ذہن و شبک دست زمانے والے
رات کی رات میں دیوار اٹھانے والے

ایک زخم اور کہ احسان کی تکمیل تو ہو
جان آنکھوں میں ہے اے تیر چلانے والے

اشک بن کر تری پلکوں سے ٹپک جاؤں گا
یاد رکھنا مجھے نظروں سے گرانے والے

عیب جُو تیغ بکف پھرتے ہیں کوچہ کوچہ
خود نہیں دیکھتے آئینہ دکھانے والے

تشنہ لب لائے ہیں تجھ تک ترے عارض کے سراب
پہلے تو پیاس بجھا آگ لگانے والے

خونِ شب چشمِ افق میں اُتر آیا آخر
ہر دریچے سے مرا خون بہانے والے

کوئی شب تجھ کو نہ ڈس لے کہیں تنہا پا کر
زلف آرائی کی تحریر مٹانے والے

(۱۹۷۲ء)

روحِ نیساں و صدف، جانِ گلِ تر پانی
تیغ کا، ہیرے کا، آنکھوں کا مقدّر پانی

تشنگی کیسی ہے یہ، ڈوب رہے ہیں سب لوگ
آ گیا آج تو شانوں کے برابر پانی

خلوتِ دل سے چلا، چشمِ بیاباں میں اُترا
جامۂ گوہرِ احساس پہن کر پانی

ہوں خجل اپنے گناہوں پہ، لحد، رحم تو کر
پھول بنتا ہے، سُنا، خاک کو چھُو کر پانی

ضبطِ گریہ میں نہاں، عظمتِ غم کس کی ہے
موتی بن جائے ہے پلکوں پہ سنبھل کر پانی

موجِ کوثر تھی رواں، تشنہ لبوں کے دل میں
لب جُو آ کے نہ پیتے تھے بہتّر پانی

سوچ کر ماہیِ بے آب ہے یہ بات غیاث
پی نہیں سکتا کوئی پانی میں رہ کر پانی

(۱۹۷۳ء)

عجیب رنگ میں ہم کو سیاہ بخت ملے
زبان تلخ ملی، لہجے بھی کرخت ملے

مجھے تو سرحدِ بے مائیگی پہ تُو مل جائے
کسی کو دار ملے یا کسی کو تخت ملے

یہ انفعال ہے یا اُن کی کم نگاہی ہے
سوال نرم تھے لیکن جواب سخت ملے

خیال آیا نہیں چھاؤں میں ٹھہرنے کا
اگرچہ راہ میں کتنے گھنے درخت ملے

یہ زخمِ دل بھی ہے شاہد صریرِ خامہ بھی
سخن کے شہر میں اندھوں کو تاج و تخت ملے

یہ کہتے جاتے ہیں دامن سے خون کے دھبے
مژہ کو دل کے فسانے بھی لخت لخت ملے

قریبِ منزلِ عرفاں، قریبِ دارِ غیاث
چھپائے روشنیِ قلب تیرہ بخت ملے

(۱۹۷۱ء)

صحراؤں میں لمبے رستے
سوجاتے ہیں پاگل جیسے

وعدے کی شب اتنی لمبی
اونگھ رہا ہو، پَل پَل جیسے

ماتھے پر بندیا چمکی ہے
صبح کا تارہ بے کل جیسے

رات نے لی ہے کیا انگڑائی
کھُل جاتے ہوں کس بَل جیسے

ہم ہیں غیاثؔ اک عشقِ تشنہ
وہ ہیں حسنِ مکمّل جیسے

(۱۹۶۲ء)

فصلِ گُل اپنے گلستاں میں کہاں جھانکے ہے
گُل کو ٹوٹی ہوئی شاخوں سے کوئی ٹانکے ہے
چاندنی بن کے دلھن آئے گی چوکھٹ پہ تری
شب کے آنچل پہ ستاروں کو کوئی ٹانکے ہے
وہم ہے یا کوئی پیاسا ہے ہوا کا جھونکا
آج مینخانے کے روزن میں کوئی جھانکے ہے
تم نہ آئے تو اُڑا لے گئی خوشبو کو صبا
چاندنی پھولوں کے چہروں پہ کفن ڈھانکے ہے
شعلۂ عشق نہیں باعثِ رسوائی غیاث
اور کچھ پیچھے چراغِ تہِ داماں کے ہے

(۶۱۹۷۲)

میں نے چاہا بھی نہ تھا، اس نے بُلایا بھی نہ تھا
چاندنی رات کا اِحسان اُٹھایا بھی نہ تھا

اُف ری بے مائیگیِ دشتِ تمنّا یارب
نکہتِ زلف کہاں، پھول کا سایا بھی نہ تھا

جانے کیا بات ہوئی، مجھ سے خفا تھے سب لوگ
آپ کا نام کسی بزم میں آیا بھی نہ تھا

چاندنی تھی کہ ہنسی، سب پہ برس جاتی تھی
اُس کی نظروں میں کوئی اپنا پرایا بھی نہ تھا

کسی آیت کی طرح دل میں اُتر آیا ہے
ایک چہرہ، جسے پلکوں میں سُلایا بھی نہ تھا

موم کی طرح پگھلتے گئے نشتر سارے
زخم کا بوجھ، مرے دل نے اٹھایا بھی نہ تھا

(۱۹۶۲ء)

دلوں میں زخم ہیں گلیوں سے خون پھوٹا ہے
ہمارے شہر پہ کیسا عذاب ٹوٹا ہے

نہ کوئی سایہ، نہ منزل، نہ اہتمامِ نفس
مثالِ شاخِ شجر کیا سکون ٹوٹا ہے

پیالہ زہر کا پی کر زبانِ حق کھولو
جو مصلحت سے ہے خاموش وہ بھی جھوٹا ہے

کسی نماز کی یاد آرہی ہے ہر دل کو
کسی کے پاؤں میں پیکان ایسا ٹوٹا ہے

اسی زباں کی بدولت، خدا کے گھر بھی جلے
میں کس زباں میں کہوں، کس نے کس کو لوٹا ہے

صبا کے دوش پہ سامانِ قتل بھی ہے غیاث
گلوں کے کنج سے خوشبو کا تیر چھوٹا ہے

(۱۹۷۲ء)

ہم تری زلف کے سایوں کو ترس جائیں گے
دل کو تنہائی کے یہ ناگ بھی ڈس جائیں گے

ہم اسیرِ گلِ تنہا ہیں بہار آنے دو
آشیانوں سے جو چھوٹیں تو قفس جائیں گے

ساقیا کتنا حسیں تھا ترے رندوں کا یہ خواب
لذتِ تشنگیٔ مے کو ترس جائیں گے

کھول دے اب تو درِ مے کدہ ساقی بڑھ کر
اہلِ دل آئیں گے یا اہلِ ہوس جائیں گے

(۱۹۶۵ء)

کیا ملے گا شبِ تنہائی میں منزل کا سُراغ
نہ وہ عارض کے اُجالے، نہ تبسّم کے چراغ

تیری قُربت میں میسّر ہوئے ساماں کیا کیا
مجھے نغموں کی حکومت، مجھے پھولوں کا دماغ

شفقی رنگ کہیں ہے، کہیں خوشبوئے خُتن
کیسی کلیوں سے مُزیّن ہے ترے جسم کا باغ

فصلِ گُل آئی ہے تم جا کے اسی سے پوچھو
ماسوا پھولوں کے، گلشن پہ نہیں اب کوئی داغ

آندھیاں اُٹھّیں تو انسان نے دم توڑ دیا
بُجھ گئے سارے محبّت کے مروّت کے چراغ

چہرہ اُترا ہے تو پڑھ لو مرے چہرے سے غیاثؔ
بھری محفل سے اُٹھا لایا ہوں تنہائی کے داغ

(۱۹۶۵ء)

یہ حسن و عشق اگر اپنے ہاتھ اٹھا لیں گے
سخن کے شہر کو پھر کس کا نقش پا کہیئے
عروج خاک کو ملتا ہے رنگ و نکہت سے
یہ شاخ گل نہیں، گلشن کی ہے صدا کہیئے
جسے سنبھالے ہوئے تھے امید دید کے ہاتھ
وہ ایک اشک بھی پلکوں سے گر گیا کہیئے
ہمارے دل نے لٹائے ہیں بے جبیں سجدے
ہمارے دل سے جو کہیئے تو بے صدا کہیئے
بہت بچائے تھا شمع جنوں سے وضع لباس
تو کیا غیاث کا دامن بھی جل گیا کہیئے

(۱۹۶۹ء)

جو دل ویراں تھے گلشن بن گئے ہیں
قفس میں بھی نشیمن بن گئے ہیں

نہیں اُٹھے جو کل تک بہرِ تسلیم
وہی ہاتھ آج دامن بن گئے ہیں

تغافل کا گماں جن پر ہوا تھا
وہی لمحات بندھن بن گئے ہیں

غیاثؔ اب وہ کہاں باتیں دلوں کی
نظر کے شعبدے فن بن گئے ہیں

(۱۹۵۰ء)

صبح آئے تو ترے مکھ سے ضیا برسائے
رات آئے تو ترے نیَن سے کجرا لائے

وصل خواہاں کہ تری زلفوں میں نیند آجائے
ہجر کوشاں کہ مری آنکھ نہ لگنے پائے

روز ملتے ہیں وہ پلکوں میں پرو کر آنسو
مجھ پہ وہ ظلم نہ کر کے بھی بہت پچھتائے

تیری باہوں کی بہشت اور ہجوم غم میں
اک کڑی دھوپ میں زلفوں کے مہکتے سائے

جب بھی خلوت میں ترے قرب کے دیپک سے جلے
اور گہرے ہوئے کچھ اور دھندلکے سائے

برق چمکی تو ترے لب پہ تبسم آیا
جب گھٹا چھائی تو گیسو بھی ترے لہرائے

قربتِ حسن بھی صحرا میں ہوئی رقص کناں
پائے طاؤس پہ نینوں نے گہر برسائے

(۱۹۶۵ء)

اندھیرا کس لئے ہنگامِ صبح ٹھہرا ہے
کسی کے رُخ پہ ابھی گیسوؤں کا پہرہ ہے

کہاں سے کس سے ہوئی ابتدا محبت کی
سمندروں سے زیادہ یہ راز گہرا ہے

ادائے قتلِ تبسم پہ بھی نثار ہے دل
یہ چاندنی کا لہو ہے مگر سنہرا ہے

ہمیشہ عشق زمان و مکاں سے ہے بالا
دلوں کے ساز پہ یہ بھیرویں کا لہرا ہے

کس اشتیاق سے سنتا ہے دل کی سرگوشی
زمانہ یوں تو غیاث ابتدا سے بہرہ ہے

(۱۹۷۰ء)

میری غزلوں میں مرا طرزِ سخن بھی دیکھو
میرے جذبات بھی، افکار بھی، فن بھی دیکھو

اب کوئی آرزو باقی نہیں اپنے دل میں
کیسا برباد ہے پھولوں کا وطن بھی دیکھو

پیاسی آنکھوں کیلئے یوں تو دھنک بھی بس ہے
روح مقروض ہو جس کی وہ بدن بھی دیکھو

نکہتِ گل میں نمی ہے کہ پسینہ گل کا
پاؤں بوجھل ہیں صبا کے یہ تھکن بھی دیکھو

ایک بے فاصلہ مہتاب ہے، بے سمت چمن
لے گئی ہم کو کہاں، دل کی لگن بھی دیکھو

آنکھ کی پتلی نے تصویر بھی لی، بات بھی کی
کیسے خاموش تھے ہونٹوں کا جتن بھی دیکھو

(۱۹۷۰ء)

سکون ملتا ہے دل کو جو خون اُگلتا ہے
حجاب و ہجر کے سایے میں عشق پلتا ہے

جسے شعورِ محبّت کا اعتبار نہیں
وہ ایک شخص مرے آنسوؤں سے جلتا ہے

اَنا کی تیغ لیے، شاعری کا جال لیے
ازل سے کوئی مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

یہ ماہ و مہر بہت بے قرار رہتے ہیں
کہ انتظار میں پہلو کوئی بدلتا ہے

شکست اصل میں احساس کا ہے نام غیاثؔ
کہ فتح پا کے بھی انسان ہاتھ ملتا ہے

(۱۹۷۲ء)

جب تلک تیرا نقشِ پا نہ ہوا
راہرَو کوئی رہنما نہ ہوا

آنکھ یوں تھی کہ دیکھتی ہی رہی
لبِ خاموش تھا کہ وا نہ ہوا

شبِ مہتاب کٹ گئی آخر
سایہ دیوار سے جدا نہ ہوا

میری حیرت پہ تجھکو حیرت کیوں
روبرو تیرے آئینہ نہ ہوا

پاؤں سجدوں میں یاد آئے ہیں
دل کسی وقت پارسا نہ ہوا

غمِ انساں پہ کی نظر تو غیاثؔ
مُسکرانے کا حوصلہ نہ ہوا

(۱۹۵۴ء)

پھول جب شاخ پہ جل جاتے ہیں
پتّے کانٹوں میں بدل جاتے ہیں
چاند تاروں کا سفر بے منزل
رات کے ساتھ نکل جاتے ہیں
قُرب کی آنچ میں سارے شکوے
موم کی طرح پگھل جاتے ہیں
جام بدلے ہیں نہ ساقی بدلا
لوگ بے وجہ بدل جاتے ہیں
ٹوٹ جاتے ہیں ستارے سرِ چرخ
نالے کس سمت نکل جاتے ہیں

(۱۹۶۰ء)

نین سے اڑ کر نیند کا پنچھی ریشم کا ہو جاتا ہے
بھینی بھینی خوشبو والی زلفوں میں کھو جاتا ہے
تجھ سے مِل کر، تجھ کو بُھلانا میرے بس کی بات نہیں
اک سپنا بہہ جاتا ہے، اک آنکھوں میں سو جاتا ہے
خون کی برساتیں لے لے کر سَو سَو لمحے آتے ہیں
پلکوں کے دامن کے دھبّے اک لمحہ دھو جاتا ہے

(۱۹۶۵ء)

جب سے تعبیرِ خواب اُلٹی ہے
کان اندھے ہیں، آنکھ بہری ہے

کبھی سستی، کبھی یہ مہنگی ہے
زندگی اصل میں پہیلی ہے

آنکھ میں ہونٹ، ہونٹ پر مہریں
میں نے تصویر تیری دیکھی ہے

کاخ رکھا ہے تم نے گھر کا نام
نام اُلٹو تو بات گہری ہے

رات ساری میں جاگتا ہی رہا
لوگ کہتے ہیں بات چھوٹی ہے

کس نے دیکھا ہے مسکرا کے غیاث
فصلِ گل، شاخِ گل پہ ٹھہری ہے

(۱۹۷۳ء)

اشعار

لفظوں کے پیراہن اُترے، مہکے جب معنوں کے بدن
تشبیہوں کے لب کھُلتے ہی پھیلی ہے خوشبوئے ختن

اُمیدوں کے بادل آئے، لیکن برسے اور کہیں
آنکھوں میں آنسو آتے ہی ٹکڑے ٹکڑے نیل گگن

خوشبو کی مانند چمن کے راز مرے دل میں ہیں نہاں
کلیوں سے سیکھا ہے میں نے ہونٹوں کو سی لینے کا فن

دل کا رشتہ نہ کہیں عہدِ کہن سے ٹوٹے
جیسے آئینہ گرے فرش پہ چھن سے ٹوٹے

حُسن کی آنکھ میں انصاف نہیں کس نے کہا
تیر تو عشق کے دل میں بھی ترازو نکلے

وہ جام پلائے ہیں کہ ہوں مست ابھی تک
آنکھوں کے سُبونے کبھی ہونٹوں کے سُبونے

رہ رہ کے شفق زار میں ڈھونڈ رہا ہوں
یاقوت میں ترشے ہوئے ہونٹوں کے نمونے

نکہتِ گل سے سُبک، چاند کی کرنوں سے لطیف
اے غمِ عشق، ہر اک چیز سے تو نازک ہے

تیرا مکتوبِ معطّر مرے سر آنکھوں پر
دل نے محسوس کیا ہے گل تر آنکھوں پر

شب کے ہزار پا کی گرفتوں کو توڑ کر
سورج نکل رہا تھا، مگر ہانپتا ہوا

یہ بات صاف ہے، ساقی کا دل ہی صاف نہیں
شکستِ جام کوئی وجہِ اختلاف نہیں

بموجِ یاس گہر بار اک صدف آیا
ترا خیال قفس میں بھی گل بکف آیا

کوئی چھپ چھپ کے سنورتا ہے بہت رات گئے
چاند خلوت میں اُترتا ہے بہت رات گئے

صبح کے ساز پہ وہ میری غزل گاتا ہے
اور دانستہ بِسَرتا ہے بہت رات گئے

سیڑھیاں خانۂ احساس میں کر کے تعمیر
وہ دبے پاؤں اُترتا ہے بہت رات گئے

لب کے دروازے تک آ کے پلٹ جاتا ہے
دل، کہ ہر سانس پہ مرتا ہے بہت رات گئے

کیا غیاثؔ اب بھی وہی دستِ مسیحا اکثر
زخمِ تنہائی کا بھرتا ہے بہت رات گئے

(۱۹۶۵ء)

کیا معطّر ہے چمن کا گوشہ
اک کلی رات کو مہکی ہوگی

سنتے ہیں حسن کی خلوت میں گئی
ہجر کی رات بھی بھولی ہوگی

صبح ہوتے ہی نئے سورج نے
آنکھ کہسار پہ رکھی ہوگی

عشق نے حسن سے بازی جیتی
شرط ایثار کی ٹھہری ہوگی

تیرے رخسار پہ بادِ سحری
ایک پل کے لئے ٹھہری ہوگی

مسکرائی ہے وفا کی جرأت
روشنی دار پہ پھیلی ہوگی

تتلیاں کس پہ نچھاور ہیں غیاثؔ
پھول بن میں وہ اکیلی ہوگی

(۱۹۷۱ء)

ہزار رنگ بدلتا ہے پھول کا چہرہ
چمن میں جھومتا، کھیتوں میں ناچتا چہرہ

گیا تھا ساحلِ دریا پہ کل تو دیکھا تھا
شفق لبوں پہ لگائے تھا شام کا چہرہ

کوئی نہ دیکھ سکا آرزو تو سب کو تھی
میں چیختا رہا میلے میں کھو گیا چہرہ

وہ چھوڑ جاتے ہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ گھر میں
وہ جا چکے مگر آنکھوں میں رہ گیا چہرہ

غیاث آئینہ خانے میں محوِ حیرت تھا
نقاب اٹھائی تو لاکھوں میں ایک تھا چہرہ

(۱۹۷۱ء)

وہ دردِ دل کی بجائے لگائے سینے سے

عدوے حسن و جوانی کو

یعنی ننّھی لاسی کو لے کے آئی ہے

تو میری بیوی نے پوچھا کہ ننّھی بچّی کو

نمونیا کی شکایت ہے

آلہ لاؤں کیا؟

میں سوچتا ہوں

کہ آلے کی اب ضرورت کیا

مرض بھی معمولی

دوا بھی معمولی



(۱۹۷۲ء)

خلوتِ شاہ میں آہٹ ہوئی گھنگرو بولے
دستِ تحقیق نے گل پوش دریچے کھولے
چشمِ تاریخ نے پلکوں کی اٹھائی چلمن
دلِ شاعر کے دھڑکنے کی صدا آتی تھی
اور اُردو کی غزل جام بکف، نغمہ بلب
اپنے خالق کے شبستان میں لہراتی تھی

حُسن اور عشق کی باہنوں میں ہے اُردو کا ازل
دل کے ایواں میں ضیا بار ہے مہتابِ غزل



(۱۹۶۷ء)